احمد ندیم قاسمی
نیلا پتھر

فہرس

قاسم
کے نام

جو میرا عزیز بھی ہے اور ہم دونوں کا موضوعِ فن
بھی مشترک ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرا فن
افسانہ نویسی ہے اور اُس کا، فوٹو گرافی ——

گزارش

کسی بھی تخلیقی فن کار کے لئے موضوعات کبھی کمیاب نہیں ہوتے۔ اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے آس پاس موضوعات کم ہو رہے ہیں تو یہ کمی دراصل خود اس کے اندر ہوتی ہے۔ میرے ساتھ المیّہ یہ ہے کہ میں نے موضوعات کی کمی کبھی محسوس نہیں کی، مگر میرے حالات نے مجھے اتنا مصروف کر دیا ہے کہ میری افسانہ نگاری کی رفتار بہت سُست پڑ گئی ہے۔ اس سُست رفتاری کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جیسے جیسے میری عمر بڑھ رہی ہے، لفظ گراں بہا ہو رہا ہے؛ چنانچہ قارئین میرے اس دَور کے افسانے پڑھ کر محسوس کریں گے کہ مَیں الفاظ کی فضول خرچی سے ممکن حد تک اجتناب کرتا ہُوں اور میرے ان افسانوں میں شاید کوئی ایک لفظ بھی زاید یا فالتو نہیں ہے۔ یوں ایک ایک لفظ کی ذمّہ داری قبول کر کے لکھنا بہت دِقّت طلب کام ہے۔

"کپاس کا پھُول" کی اشاعت کے بعد مَیں نے کُل سات افسانے لکھے ہیں جو "نیلا پتھر" میں شامل ہیں۔ آخر میں دو ایسے افسانوں کو بھی شامل کر لیا ہے جو "سناٹا"، "بازارِ حیات"، "برگِ حنا"، "گھر سے گھر تک" اور "کپاس کا پھول" مرتّب کرتے ہوتے میرے ذہن سے اُتر گئے، اور اگر ان میں سے کوئی یاد آیا، تو وہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اب دونوں دستیاب ہو گئے ہیں، تو انہیں "نیلا پتھر" میں شامل کر رہا ہُوں۔ عُمر کے اس مرحلے میں سوچنے لگا ہُوں کہ جو کچھ محفوظ ہو سکتا ہے اسے محفوظ ہو جانا چاہیئے۔

ندیم

۲۰ مارچ ۱۹۸۰ء

لاہور

احسان

دھوپ نشہ آور تھی، مجھ پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

اس وقت آسمان اتنا نیلا ہو رہا تھا جیسے اسے چھُو لو، تو پوریں نیلی پڑ جائیں۔ سُورج مشرق میں پینتالیس کے زاویئے پر تھا۔ رات کی بارش میں اینٹوں کی چھت دھل گئی تھی اور دھوپ نے اینٹوں کو صیقل سا کر دیا تھا۔ اتنی کھلی چھت پر میں ایک کرُسی اور ایک تپائی رکھ کر اخبار پڑھنے لگا تو وہ مجھے اجنبی اجنبی سا لگا۔ سو میں نیچے جا کر ایک رسالہ اُٹھا لایا اور تب دھوپ کو شرارت سوجھی اور میں غنودہ سا ہونے لگا۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے اپنے پپوٹے لہو کی طرح لال نظر آئے۔ میں نے سوچا کتنی عجیب بات ہے کہ ہم بند آنکھوں سے بھی دیکھ سکتے ہیں جیسے اس وقت میں اپنے پپوٹے دیکھ رہا ہوں۔ کوشش کی جائے تو بند پپوٹوں سے شاید اور بھی بہت کچھ دیکھا جا سکتا ہو۔

میں نے غنودگی سے جنگ کرنے کی ٹھانی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو میں نے ناشتہ کیا تھا۔ یہ بھی کوئی سونے کا وقت ہے۔ یہ علم الابدان کا کوئی راز ہوگا کہ جب سرما کی دُھوپ میں انسان اپنی نظریں کتاب پر یا کسی ایک نقطے پر مرکوز کر دے تو اسے نیند آنے لگتی ہے۔ نیند سے بچنے کے لئے میں رسالے کی ایک غزل گنگنانے لگا، مگر میری گنگناہٹ بہت مدھم تھی۔ ممکن ہے پڑوس کی چھت پر خواتین میری طرح بیٹھی دھوپ سینک رہی ہوں۔ میری اور پڑوس کی چھت کے درمیان جو حدِ فاصل تھی وہ انسان کے اوسط قد سے بھی ہاتھ بھر

اونچی تھی۔ پھر جہاں پردے کے سلسلے میں اتنی احتیاط برتی گئی ہو، وہاں بلند آواز سے گنگنانا معیوب ہی ٹھہرے گا۔

دھپ دھپ کی آواز سے میں چونکا۔ پہلے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر اُٹھ کر نیچے صحن میں جھانکا۔ میرے گھر کا دروازہ بند تھا۔ میں پلٹا تو دھپ دھپ کی ایک اور آواز آئی۔ اب میں نے اس کی سمت معین کر لی تھی۔ یہ آواز چھتوں کی حدِ فاصل کی دوسری جانب سے آ رہی تھی۔ میں سمجھا بچے کھیل رہے ہیں سو واپس آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

ایک بار پھر دھپ دھپ ہوئی اور پھر ایک نسوانی آواز آئی۔ "سنیئے!"

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا۔ "جی۔ آپ مجھ سے تو مخاطب نہیں ہیں؟"

"آپ ہی سے مخاطب ہوں۔" آواز آئی۔ "مجھے معلوم ہے آپ اس مکان میں دو چار روز پہلے ہی تشریف لاتے ہیں اور آپ سے کوئی جان پہچان بھی نہیں، مگر سوچا آپ کو تکلیف دے کر دیکھتی ہوں۔ آپ کا کوئی ملازم ہے گھر کے کام کاج کے لئے؟"

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔ "ہوٹل سے کھانا کھا لیتا ہوں۔"

"اس وقت آپ کے پاس کوئی دوست بیٹھے ہوں تو ان سے کہہ دیجئے۔"

"جی نہیں۔" میں نے بتایا۔ "اکیلا ہوں، مگر آپ کہیئے تو، کوئی کام ہے کیا؟"

"جی ہاں۔" آواز آئی۔ "میرے اباجی پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور گھر میں صرف مَیں ہوں۔ دن کا وقت ہے اور میں پردہ کرتی ہوں۔ ایک دوا لانی ہے دوکان سے۔ نسخہ میرے پاس ہے۔ کیا آپ تکلیف کر سکیں گے؟"

"بخوشی۔" میں نے کہا۔ "میں ادھر گلی میں آپ کے دروازے پر آتا ہوں۔ نسخہ دے دیجئے تو ایک منٹ میں دوا لاتا ہوں۔ دواؤں کی دوکان تو چند قدم پر ہے — گلی کے موڑ پر۔"

"خدا آپ کا بھلا کرے۔"

میں فوراً نیچے گلی میں آیا اور پڑوس کے دروازے کے پاس کھڑا ہو گیا۔ دروازے پر پردے کے لئے ایک پُرانا پلنگ پوش آویزاں تھا۔ اپنی موجودگی کا بتانے کے لئے میں کھنکارا تو دبی دبی آواز آئی۔ "اچھا آپ تشریف لے آئے! یہ لیجئے۔"

ایک ہاتھ لٹکی ہوئی چادر کے ایک طرف سے نکلا۔ سانولا۔ سانولا اور تازہ تازہ سا جیسے ابھی دھل کر نکلا ہے۔ ہاتھ چاہے میلا ہو چاہے صاف، سانولا ہو چاہے سفید، انسان کی عُمر بتا دیتا ہے۔ لوگ عمروں کے اندازے کے لئے خواہ مخواہ چہروں کو گھورتے رہ جاتے ہیں۔ ہاتھ انسانی عمر کا سچا غماز ہوتا ہے۔ وہ کمپیوٹر کی سی صحت کے ساتھ انسانی عمر کا اعلان کر دیتا ہے۔ اس سانولے اور تازہ ہاتھ والی کی عُمر بیس بائیس برس کے آس پاس ہو گی۔

مَیں نے اس ہاتھ کے انگوٹھے اور انگشتِ شہادت کی پوروں کے درمیان تھما ہوا نُسخہ اور ایک روپے کا نوٹ لے لیا اور کہا! "میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔"

"جی شکریہ۔" آواز کو شعوری طور پر دبا کر سرگوشی بنا دیا گیا تھا۔

عام سی دوا تھی۔ میں دو گولیاں لے کر فوراً پلٹا اور ایک بار پھر دروازے پر کھنکارا۔

"ارے! اتنی جلدی!" ہاتھ چادر کے ایک طرف سے باہر آیا۔ "خُدا آپ کا بھلا کرے۔ آپ نے بڑا احسان کیا ہے۔"

"احسان!" میں نے حیرت سے کہا اور گولیاں نسخے سمیت ہتھیلی پر رکھ دیں۔ "احسان کا وزن تو بہت بھاری ہوتا ہے بی بی۔ ان دو گولیوں کا وزن تو احسان کے وزن کے پاسنگ بھی نہیں۔"

"جی میں گولیوں کے وزن کی بات نہیں کر رہی ہوں۔" آواز آئی۔ "ایک اجنبی کے لئے چھت سے اترنے، یہاں آنے اور دوا لانے کا اپنا ایک وزن ہے۔ آپ نے احسان کیا ہے اس لئے وزن کو محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے احسان لیا ہے اس لئے میری گردن احسان کے بار سے جھکی ہوئی ہے۔ بہت بہت شکریہ۔"

پھر مجھے اس کے جانے کی آواز آئی اور میں نے اپنے گھر کی چھت پر آ کر رسالہ کھول لیا، مگر وہاں سب لوگ حیات و کائنات کے مسائل سمجھنے میں لگے ہوئے تھے۔ میری دستگیری کون کرتا۔ میں نے رسالہ میز پہ رکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور پپوٹوں کی لہولہو سرخی کے پار دیکھنے لگا جہاں سے ایک ہاتھ چٹکی میں کاغذ کا ایک پرزہ لئے اُبھرا اور پھر جیسے لہولہو ہو کر سُرخی میں تحلیل ہو گیا۔ ایک بار پھر اُبھرا، پھر تحلیل ہو گیا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ چھوٹی بات! میں نے سوچا۔ مجھے لڑکی کا ہاتھ نظر آ رہا ہے مگر اس کا فالج زدہ باپ کھائی نہیں دے رہا ہے جس کے لیے دوا لانے والا ہی کوئی نہیں۔

میں رسالے کو بغل میں مار کر نیچے کمرے میں آ گیا۔ ہر شے ٹھٹھری ہوئی تھی مگر خود میں کتنا تپ رہا تھا۔ ہم مشرقی لوگ بھی عجیب ہونق لوگ ہیں۔ اپنے لئے اتنے فلک بوس اخلاقی قلعے تعمیر کرتے ہیں اور پھر تاک میں بیٹھ جاتے ہیں کہ قلعے کی دیوار پھٹے تو باہر کے منظر کی کوئی جھلک نظر آئے۔ ہم خود ہی اپنی آنکھوں کو اندھا کر کے عُمر بھر اپنے اندھے پن کا علاج ڈھونڈتے رہتے ہیں۔

شام کو میں گھر سے نکلا تو چار قدم پر ہی پڑوس کا وہ دروازہ تھا جس پہ ایک پُرانا پلنگ پوش لٹک رہا تھا۔ سوچا، لڑکی کے ابا کی مزاج پرسی کر لینی چاہیئے۔ پڑوسیوں کے تو ایک دوسرے پر بہت حقوق ہوتے ہیں۔ میں نے بڑھ کر دروازے پر ہلکی سی دستک دے ڈالی۔

"کون!" دُور سے لڑکی کی آواز آئی۔

"جی میں۔ آپ کا پڑوسی۔" میں نے کہا۔ "اب آپ کے ابا جی کے مزاج کیسے ہیں؟"

"اچھا تو آپ ہیں!" اس کی آواز میں اطمینان تھا۔ "میں اُوپر چھت کی دیوار پر بہت دیر تک دھپ دھپ کرتی رہی۔ پھر سوچا آپ کہیں چلے گئے ہیں۔"

"جی میں تو نیچے کمرے میں تھا۔" میں نے کہا۔ "آپ میرا دروازہ کھٹکھٹا دیتیں۔"

وہ بولی۔ "اس کے لئے مجھے دن کو گلی میں جانا پڑتا اور میں عرض کر چکی ہوں کہ میں

پردہ کرتی ہُوں۔"

"جی۔" میں مسئلے کی نزاکت کو سمجھ گیا۔

وہ کہنے لگی۔ "اب یہ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے کہ آپ گلی میں میرے دروازے پر کھڑے ہیں اور میں پردے کے پیچھے سے آپ سے باتیں کر رہی ہوں اور آپ جانتے ہیں کہ ہمارے لوگ پَرسے کوّا بنانے کے فن میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔"

یکایک مجھے اکٹھا بہت سا احساسِ جرم ہوا۔ میں نے ایک قدم ہٹ کر کہا: "آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ میں چلتا ہوں۔ میں تو صرف مزاج پُرسی۔"

"مگر آپ نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں آپ کو کیوں بلا رہی تھی۔" اس نے لٹکتے ہوئے پلنگ پوش کا ایک کنارا ہاتھ میں لے لیا۔ کمپیوٹر چلنے لگا۔

"جی، جی۔" میں نے کہا۔ "فرمایئے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہے؟"

"ڈاکٹر کو بلانا ہے۔" اس نے کہا۔ "ابا جی کی حالت ویسی ہی ہے اور پہاڑ جیسی رات آنے والی ہے۔ میں کل شام کے اندھیرے میں برقعہ اوڑھ کر ڈاکٹر عبدالقدوس کو بلا لائی تھی۔ انہی کو پھر بلانا ہے۔ قریب ہی ہیں۔ آپ کو تکلیف ہو گی مگر کیا کروں۔ ابا جی کو تنہا چھوڑتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ ڈاکٹر صاحب فوراً آ جائیں گے۔ ابا جی سے ان کی جان پہچان ہے۔"

"ابھی لاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں نے ان کے کلینک کا بورڈ دیکھا ہے۔"

ڈاکٹر صاحب ایک معمّر اور نحیف و نزار بزرگ تھے۔ وہ نسخہ لکھ رہے تھے اور ایک تنومند مریض ان کے سامنے بیٹھا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے یہ مریض دراصل ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر صاحب دراصل مریض ہیں۔ میں نے جا کر عرض کیا تو فوراً نسخہ مریض کے حوالے کیا، سٹیتھسکوپ اُٹھا کر میرے ساتھ چل پڑے۔

میں نے جا کر دستک دی اور ساتھ ہی کہا: "ڈاکٹر صاحب تشریف لے آئے

ہیں۔"

"جی اچھا" دُور سے آواز آئی۔ پھر پلنگ پوش پُورے کا پُورا اُٹھ گیا۔ لڑکی پوری کی پوری میرے سامنے کھڑی تھی۔

میں سمجھا اس نے بدحواسی میں پردہ اٹھا دیا تھا، چنانچہ میں گھبرا کر پیچھے ہٹا تو وہ بولی "کوئی بات نہیں۔ آپ بھی آجایئے۔ میں نے ابا جی کو بتا دیا ہے۔" پھر وہ ڈاکٹر صاحب کی طرف بڑھی۔ "ابا جی سُن بھی رہے ہیں، دیکھ بھی رہے ہیں۔ بس بول نہیں سکتے۔"

اور جب وہ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ دوسرے کمرے کی طرف جانے لگی تو میرے دل نے گواہی دی کہ کمپیوٹر کا اعلان حرف بہ حرف، نُقطہ بہ نقطہ درست تھا۔

یہ گھر بالکل میرے گھر کے مشابہ تھا۔ گلی میں کھلنے والا دروازہ دراصل پہلے کمرے کا دروازہ تھا۔ دوسرا کمرہ ملحق تھا۔ بغل میں باورچی خانہ اور کائنات ختم۔ اگر حیوانات اشرف المخلومات ہوتے اور انسانوں کو پالتو جانوروں کی طرح رکھتے تو ان کے لئے ایسے ہی ڈربے بناتے۔

ڈاکٹر صاحب اور لڑکی تو دوسرے کمرے میں چلے گئے اور میں کھڑا یہ سوچتا رہ گیا کہ ایک ہی دِن میں ایک جوان پردہ نشین کا یوں بے تکلفی سے سامنے آجانا ضرورتاً بھی ہو سکتا ہے اور مجبوراً بھی۔ ضرورتاً یوں کہ باپ کی بیماری میں کام آنے والا کوئی تو ہونا چاہیئے اور مجبوراً یوں کہ ــــ آخر سبھی کے سینے میں دل ہوتا ہے اور باپ بیمار بھی پڑا ہو تو دل کے احکام ٹالے نہیں جا سکتے۔

"آپ تو باہر کھڑے رہ گئے۔" لڑکی دوسرے کمرے کے دروازے میں نمودار ہوئی۔ "اپنوں سے کیا پردہ۔ آجایئے نا!"

ایک کوندے کی طرح یہ فیصلہ میرے دل و دماغ میں لپک گیا کہ معاملہ ضرورت کا نہیں ہے، مجبوری کا ہے۔ مجھے محسوس ہُوا کہ اس ایک لمحے میں میرا قد ایک آدھ انچ

ضرور بڑھ گیا ہو گا۔

لڑکی کے ابا جی خاصے وجیہہ، مگر بے حد کمزور بزرگ تھے۔ چھوٹی سی آدھی سفید آدھی سیاہ ڈاڑھی تھی۔ مجھے دیکھا تو ان کی آنکھوں نے ان کے ہونٹوں کے فرائض انجام دیئے۔ وہ مُسکرا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی یہ مُسکراہٹ نظر آگئی۔ بولے۔ "صبیحہ بیٹی۔ قریشی صاحب اس نوجوان کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔" میں سمجھا صبیحہ جھینپے گی مگر وُہ بظاہر ذرا سی بھی تو نہیں جھینپی۔ صرف اتنا بولی۔ "میں ابا جی کو بتا چکی ہوں کہ ہمارے یہ پڑوسی صاحب بڑا دَردمند دل رکھتے ہیں۔"

اب تو میں صبح و شام ذرا سی دستک دے کر پردہ اٹھاتا اور اندر چلا جاتا۔ میں قریشی صاحب کی دوا کے علاوہ ان کے گھر کا سودا بھی لانے لگا۔ ایک دن صبیحہ نے مجھ سے بال پنیں تک منگوائیں، البتہ بات چیت "تکلیف معاف" اور "آپ نے بڑا احسان کیا ہے" سے آگے نہ بڑھی۔ صبیحہ مجھے دیکھتے ہی بہت فراخدلی سے مسکراتی تھی اور مجھے کام پر روانہ کر دیتی تھی اور رات کو جب میں بستر پر لیٹتا تھا تو اس کی ایک ایک حرکت کا بہت گہرا نفسیاتی تجزیہ کرتا تھا۔ سودے کے لئے رقم دیتے ہوئے اس کی پوریں میرے ہاتھ سے یوں ہی تو نہیں چھو گئی تھیں۔ پرسوں شام کو وہ میرے سامنے دوپٹے کے بغیر یوں ہی تو نہیں آگئی تھی۔ مجھ سے جو اس نے کہا تھا کہ اگر آپ نہ ہوتے تو میں رُل جاتی، تو اتنی بامعنی بات اس نے یوں ہی تو نہیں کہہ ڈالی تھی۔ نہیں، میں اُسے رُلنے نہیں دُوں گا۔ ایسی ہیرا لڑکیاں رُلنے کے لائق نہیں ہوتیں۔

ایک رات میں نے طے کیا کہ اب اظہار میں تاخیر نہیں کرنی چاہیئے۔ کہیں وُہ یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ مجھ میں جرأت کی کمی ہے، چنانچہ صبح کو سودا لا کر دینے کے بعد میں گھر آیا تو آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اظہار کی مشق کرتا رہا۔ پھر باہر گلی میں جانے کے لئے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو اس وقفے میں پہلی بار محسوس ہُوا کہ صبیحہ کے دروازے پر

دستک دینے کے لئے شیر کا کلیجہ چاہیئے۔

اور ابھی میں اپنے مرجھاتے ہوئے حوصلے کو تازہ دم کرنے کے مرحلے میں تھا کہ وہ میرے سامنے آگئی۔ "اویس صاحب! ذرا جلدی سے آجایئے" پھر فوراً ہی وہ مشین کی طرح پلٹ گئی۔

میں باہر لپکا۔ پردہ اٹھا کر اندر گیا تو وُہ دوسرے کمرے میں تھی۔ میں سیدھا وہاں پہنچا تو وہ اپنے آبا جی پر جھکی چمچے سے انہیں پانی پلا رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو بولی: "آبا جی بیہوش ہوگئے تھے۔ مَیں نے گھبرا کر آپ کو بلالیا۔ اب ٹھیک ہیں۔" پھر قریشی صاحب پر جُھک کر پوچھا "آبا جی، اب آپ ٹھیک ہیں نا؟"

قریشی صاحب کے تیور اگرچہ منجمد تھے، مگر ان کے چہرے کے کسی نہ کسی حصّے سے اس جواب کا تاثر مِل رہا تھا کہ —— ٹھیک ہوں بیٹی۔

بڑی احتیاط سے گردن تک لحاف اوڑھا کر وہ بولی "چائے پیئں گے نا آبا جی؟" پھر جیسے اس نے جواب سُن لیا ہو۔ بسور کر بولی "میں رونے بیٹھ جاؤں گی یہیں آپ کے سینے سے لگ کر۔ یہ اویس صاحب بھی مجھے چپ نہیں کراسکیں گے۔ ہاں —— لاؤں چائے؟" پھر وہ خوش ہوکر سیدھی ہوگئی اور مجھ سے کہنے لگی "آبا جی راضی ہوگئے ہیں۔"

کمرے سے باہر نکلی تو میں بھی ساتھ ہی چلا آیا۔ مجھے ایک مونڈھے پر بیٹھنے کو کہا تو میں نے انکار کر دیا "چائے میں بناؤں گا۔" میں نے کہا۔

وُہ گھڑی سوچتی رہ گئی۔ پھر مُسکرائی اور بولی "آیئے۔ مِل کر بناتے لیتے ہیں۔"

میرے باورچی خانے کا سا باورچی خانہ تھا، چنانچہ ایک بار تو میں سمجھا وہ میرے گھر میں ہے اور میرے لئے چائے بنا رہی ہے۔ اظہار کے لئے یہ مناسب ترین وقت تھا —— مگر کیا یہ مناسب ترین وقت تھا؟

کیتلی کو چولھے پر رکھ کر وہ بولی "آج آپ اتنے چُپ کیوں ہیں اویس صاحب؟"

"چپ؟" مَیں نے پوچھا "کون؟ مَیں؟ مگر میں ایسا باتونی کب تھا صبیحہ صاحبہ۔"

ایک دم مجھے احساس ہَوا کہ اگر میں "صبیحہ" کے ساتھ "صاحبہ" کا لاحقہ نہ لگاتا تو آدھا اظہار تو یوں ہی ہو جاتا۔

"میں نے کب کہا کہ آپ باتونی ہیں۔" صبیحہ پیالیاں دھوتے ہوئے بولی "بس آپ مجھے کھوئے کھوئے سے لگے اس لئے پوچھ لیا اور اس لئے بھی پوچھ لیا کہ کھویا کھویا تو مجھے لگنا چاہیئے۔"

یہ بھی اظہار کا ایک پہلو ہے، میں نے سوچا۔ اب لوہا گرم تھا۔ میں نے ضرب لگانے کا فیصلہ کر لیا۔ "بات یہ ہے صبیحہ ——" "صاحبہ" کہنے سے پہلے میں نے حلق میں اٹکا ہوا کا گولا نگلنا چاہا، کہ ادھر سے قریشی صاحب کی بہت لمبی کھانسی کی آواز آئی اور صبیحہ گولی کی طرح باورچی خانے سے نکل گئی۔ مَیں نے اس دوران میں چائے تیار کرلی۔ دودھ گرم کر لیا۔ ایک پُرانے گھسے ہوئے طشت میں سب چیزیں سجائیں تو وہ واپس آئی۔

"ارے!" وہ مُسکرا کر بولی "آپ تو لڑکیوں کی طرح سلیقہ مند ہیں۔"

لڑکیوں کی طرح! —مَیں نے ناگواری سے سوچا۔ پھر کہا "سلیقہ مندی پر صرف لڑکیوں کا اجارہ تو نہیں صبیحہ صاحبہ" —— ناگواری کی وجہ سے میں صاحبہ کے لفظ کو روک نہ سکا۔

"میں نے آپ کی صنف پر تو حملہ نہیں کیا اویس صاحب" وہ بولی "ویسے یہ تو آپ مانیں گے کہ سلیقہ مندی میں فوقیت لڑکی ہی کو حاصل ہے۔" پھر طشت اُٹھا کر بولی "آیئے۔ آپ ادھر کمرے میں تشریف رکھیں۔ میں آبا جی کو چائے پلا کر حاضر ہوتی ہوں۔ آیئے۔"

میں اس کے پیچھے اسی کمرے میں آیا جس کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا اور جس پہ پُرانا پلنگ پوش لٹک رہا تھا۔ مجھے ایک مونڈھے پر بٹھا کر اس نے چارپائی پر پڑی

ہوئی ایک کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ "جب تک آپ یہ کتاب دیکھئے۔"

یہ ٹالسٹائی کی "اینا کرینینا" تھی۔ میں نے اسے پڑھ رکھا تھا اس لئے پرلی طرف ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پر پڑی ہوئی کتابوں کے پاس گیا۔ سب سے اوپر ایذرا پاؤنڈ کی نظموں کا مجموعہ رکھا تھا۔ اس کے نیچے پاسترنک کی روسی نظموں کے انگریزی تراجم کی کتاب تھی۔ پھر بیدی کا طویل افسانہ "اِک چادر میلی سی" —— نہ کوئی ڈائجسٹ، نہ کوئی نیوز ویک، نہ کوئی السٹرٹیڈ ویکلی! خاصی بقراط لڑکی معلوم ہوتی ہے!

"آج مجھے آپ سے ایک ضروری بات کہنی ہے۔" وہ اسی مونڈھے پر آکر بیٹھ گئی جس پہ مجھے بٹھا گئی تھی۔ پھر وہ اچانک اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "میرے خیال میں آپ مونڈھے پر بیٹھیں۔ میں چارپائی پر بیٹھتی ہوں۔" وہ چارپائی پر بیٹھ گئی، مگر پھر فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی اور دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ "میں چائے تو وہیں چھوڑ آئی!"

جب تک وہ طشت لے کر واپس آئی، میں مونڈھے پر بیٹھ چکا تھا۔ بیٹھنے کے باوجود مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے کھڑا ہوں۔ آج اسے مجھ سے ایک ضروری بات کہنی ہے نا۔ اور میں جانتا ہوں اس عمر میں ضروری بات کیا ہوتی ہے مگر کیا یہ ضروری بات کہنے میں پہل مجھے نہیں کرنی چاہیئے —— بہرحال دیکھتے ہیں —— دیکھتے ہیں۔

اس نے چائے بنا کر پیالی میرے ہاتھ میں تھمائی اور بالکل میرے سامنے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ "اویس صاحب" وہ بولی۔ اس کی آواز میں ایک ایسی کپکپی تھی جو چھپائی جا رہی تھی مگر چھپ نہیں رہی تھی۔ "اویس صاحب میں نے آج ابھی ابھی اپنی زندگی کے بارے میں ایک فیصلہ کیا ہے۔"

مگر فیصلہ تو میں نے بھی کر رکھا ہے، میں نے سوچا۔

"اویس صاحب۔" وہ چارپائی کو ذرا سا گھسیٹ کر میرے اور قریب آ گئی۔ "میں دُنیا کی شاید واحد لڑکی ہوں جس کی سہیلی ایک مرد ہے اور وہ آپ ہیں۔"

یہ جملہ کہہ کر صبیحہ مجھ پر سبقت لے گئی تھی۔ اس نے یہ پُرانا مفروضہ غلط ثابت کر

دیا تھا کہ عورت چاہے ہزار جان سے مرد پر فریفتہ ہو، محبّت کا اظہار ہمیشہ مرد کی طرف سے ہوتا ہے۔

"اویس صاحب۔" اب اس کی آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں۔ "میں دو بھائیوں کی ایک ہی بہن ہوں مگر میرے یہ دونوں بھائی روپے کی تلاش میں ادھر ابوظہبی اور دوبئی کی طرف نکل گئے اور دولت کے نشے میں ایسے ڈوبے کہ اس گھر سے بھی ہمیشہ کے لئے نکل بھاگے۔ امّی کا انتقال ہوا اور ابّا جی نے انہیں اس حادثے کا تار بھجوایا تو دونوں کی طرف سے ایک ہی جوابی تار آیا جو صرف ایک لفظ پر مشتمل تھا۔ —— "سوری!" —— "سوری" آپ جانتے ہیں کہ "افسوس ہے" کی انگریزی ہے۔ ابّا جی ہر روز اُٹھ کر اور ہر روز سونے سے پہلے مجھ سے پوچھتے تھے کہ صابی، تمہارے ان بھائیوں کو کس پر افسوس ہے؟ اپنی ماں کی موت پر افسوس ہے یا وہ کہنا چاہتے ہیں کہ افسوس ہم اتنے بڑے حادثے پر بھی اپنی دولت کی مشینیں روکنے سے اور پاکستان آنے سے قاصر ہیں۔ میرے یہ دونوں بھائی مجھ سے بڑے ہیں۔ شروع شروع میں خط لکھتے رہے۔ پھر وہیں شادیاں کریں اور خط بند کر دیئے۔ اب کسی آتے جاتے کے ہاتھ سلام دُعا بھجوا دیتے ہیں۔ ابھی دو ہفتے پہلے مجھے انہوں نے ایک تسبیح بھیجی تھی جس سے بہتر تسبیح میں یہیں اپنے شہر کے بازار سے دو روپے میں خرید چکی ہوں۔ سو اویس صاحب، میں ان بھائیوں کی بہن ہوں اور یاد رکھئے، یہ میرے سگے بھائی ہیں مگر دولت تو سگوں کو بھی سوتیلا بنا دیتی ہے۔"

صبیحہ نے دوپٹے کے پلّو سے آنکھیں پونچھیں اور بولی۔ "معاف کیجئے گا۔ میں رونے والی لڑکی نہیں ہوں مگر کبھی کبھی آنسو زبردستی اپنے بہنے کا جواز پیدا کر لیتے ہیں۔ آدمی سوچتا رہ جاتا ہے کہ اسے رونا کیوں آ رہا ہے اور جب تک وہ کسی نتیجے پر پہنچے، آنسو اپنا کام کر چکے ہوتے ہیں۔ آپ بور تو نہیں ہو گئے؟"

"جی نہیں۔" میں نے کہا۔ "البتّہ پریشان ہو گیا ہوں۔"

"میں بات کو مختصر کرتی ہوں۔" وہ بولی۔ "یہ باتیں جو میں آپ سے کر رہی ہوں مجھے اپنی امّی سے کرنی چاہیئے تھیں مگر وہ ہیں نہیں۔ ابا سے کرنی چاہیئے تھیں مگر وہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بھائیوں کا احوال آپ نے سُن لیا۔ اسی لئے تو میں نے ایک پڑوسی نوجوان کو اپنی سہیلی کہا ہے کہ میں اس بھری دُنیا میں آپ کے سوا کسی سے یہ بات کرنے کا حوصلہ نہیں کر سکتی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ میرا بھرم رکھیں گے اور مجھے شرمندہ نہیں کریں گے۔"

"آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں صبیحہ صاحبہ۔" میں نے احتجاج کیا۔ "میں اور آپ کا بھرم نہیں رکھوں گا! میں اور آپ کو شرمندہ کروں گا! ——— میں جو آپ کے ——— جو آپ کے ایک ———" پھر میں نے سوچا کہ اس صورتِ حال میں میری طرف سے اظہار مناسب نہیں ہوگا۔ پھر سہی۔ شام کو سہی۔

"میرے ابا بہت غریب آدمی تھے۔" صبیحہ بولی۔ "ننھی سے منیاری کی دوکان کرتے تھے۔ یہی سوئی، دھاگہ، بٹن، کنگھی، بال پنیں وغیرہ بیچتے تھے۔ ان کا ایک کھوکھا تھا۔ شام کو گھر آتے تھے تو اپنا سارا اثاثہ گٹھری میں باندھ کر لے آتے تھے مگر آفرین ہے ان کی استقامت پر اور امّی کی ہمّت پر کہ پیسہ پیسہ جمع کرتے رہے اور ہم تینوں کو پڑھاتے رہے۔ بھائیوں میں سے ایک نے ایف اے کیا اور ایک نے میٹرک اور پھر چڑیا کے بچوں کے پَر نکل آئے اور وہ دوسرے نگروں کو چل دیئے۔ اس وقت میں آٹھویں میں تھی۔ اب سارا لاڈ پیار، سارا پیسہ مجھ پر خرچ ہونے لگا مگر میں بگڑی نہیں۔ میں نے میٹرک کیا، پھر ایف اے کیا، انہی دِنوں امّی چل بسیں۔ اس کے بعد میں نے بی۔ اے کیا اور ایم۔ اے میں داخلہ بھی لے لیا مگر پھر ابا جی پر فالج کے حملے ہونے لگے۔ دو چار دن ان کا ایک بازو اور ایک ٹانگ سُن رہتے مگر پھر چلنے پھرنے لگتے، تب میں کالج چلی جاتی مگر ایک آدھ دن کے بعد ان پر پھر حملہ ہو جاتا۔ آمدنی رُک گئی۔ میرا کالج جانا بند ہوگیا اور اب کے تو ابا کی زبان ہی بند ہوگئی ہے۔ آج ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ اب ان کا صحت یاب ہونا مشکل ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میرے منہ میں خاک، آج کل پرسوں تک چل بسیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آئندہ دو تین چار سال تک زندہ رہیں مگر وہ اسی حالت میں زندہ رہیں گے ——— مفلوج حالت میں۔"

صبیحہ نے شعوری طور پر آنسو پیئے اور پھر گلا صاف کر کے بولی۔ "یہ سب پس منظر تھا اس بات کا، جو مجھے آپ سے کہنی ہے۔ اگر میں براہ راست کہہ دیتی تو آپ مجھے بے حیا سمجھتے۔ بات یہ ہے کہ ابھی محلّے میں یہ بات زیادہ نہیں پھیلی ہے کہ کھوکھے میں منیاری کی دکان کرنے والا قریشی مفلوج ہو چکا ہے۔ جس روز سارے محلّے کو یہ بات معلوم ہوگی، میں ایک ایسی لڑکی بن کر رہ جاؤں گی جو رات کے اندھیرے میں سڑک پر سے گزرتے ہوئے، غنڈوں کے نرغے میں آجاتی ہے۔ میرے گھر میں پتھروں پر لپٹے ہوئے محبّت نامے گرنے لگیں گے۔ میرے گھر کے دروازے پر لوگ، مجھ پر آوازے کسیں گے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک شخص اس گھر میں زندہ موجود ہے مگر میں اس گھر میں اکیلی رہ گئی ہوں اور ہمارا مُعاشرہ جو اپنے آپ کو بڑا مقدس کہتا ہے، اکیلی بے آسرا لڑکی پر یوں جھپٹتا ہے جیسے گدھ مردار پر جھپٹتے ہیں۔ سو میں نے فیصلہ کیا ہے اویس صاحب، کہ مجھے فوراً شادی کر لینی چاہیئے۔"

"درست فیصلہ ہے۔ بالکل درست فیصلہ۔" میں نے صبیحہ کی بھرپُور تائید کی اور تائید کرتے ہوئے میری آواز اتنی بدل گئی کہ خود میں نے اس تبدیلی کو محسوس کر لیا۔

"خدا آپ کا بھلا کرے۔" صبیحہ نے اطمینان کی سانس لی۔ "مجھے غلط مت سمجھیئے گا۔ مجھے ایک نگران ہاتھ چاہیئے۔ میں لُوٹ کا مال نہیں بننا چاہتی۔ میرے بھائی مجھے اگر اس درندہ معاشرے کے آگے ڈال گئے ہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اس درندے کا شکار ہو جاؤں۔ میں اس درندے کے پھیلے ہوئے نوکیلے پنجوں کی زد سے باہر بھی تو جا

سکتی ہوں۔ میں شادی بھی تو کر سکتی ہوں۔"

"یقیناً۔ یقیناً" میں نے تائیدِ مزید کی۔

"مجھے بس اتنی بات آپ سے کہنی تھی کہ کوئی اچھا سا رشتہ نظر میں رکھئیے۔ اچھا سے میرا مطلب شریف آدمی سے ہے جو محبت کر سکتا ہو۔ قربانی دے سکتا ہو۔ لالچی نہ ہو، تنگ ظرف نہ ہو۔ دُنیا کی خوبصورتیوں سے پیار کر سکتا ہو، دُنیا کی بدصورتیوں سے نفرت کر سکتا ہو اور اس نفرت کا اظہار کر سکتا ہو۔ مجھے کوئی دولت مند انسان نہیں چاہیئے، صرف انسان چاہیئے جو غیر معمولی نہ ہو۔ عام سا ہو، جیسے میں ہوں —— جیسے آپ ہیں۔"

اب اظہار مکمل ہو گیا تھا۔ اب مجھے مزید تفصیل پوچھنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں مونڈھے پر بیٹھا ہوا کمرے میں تیرتا پھرتا تھا۔ ایک بار جی چاہا بڑھ کر صبیحہ کو سینے سے لگاؤں اور اسے بتاؤں کہ تم نے میرے دِل کی بات کہہ دی اور کسی نے سچ کہا تھا کہ دِل کو دِل سے راہ ہوتی ہے۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ دراصل میں نے طے کر لیا تھا کہ شام تک اسے یہ بتانے آؤں گا کہ میں نے تمہارے لئے رشتہ ڈھونڈ لیا ہے۔ لڑکا تمہارے معیاروں کے عین مطابق ہے اور لڑکے کا نام اویس ہے اور وہ تمہارے پڑوس میں رہتا ہے۔

ویسے مجھے صبیحہ کی ذہانت پر حیرت ہو رہی تھی کہ اظہارِ محبت کا یہ بالواسطہ طریقہ آج تک اور کسے سُوجھا ہوگا۔

"ایک رشتہ میری نظر میں ہے۔" میں نے کہا۔ "شام تک آپ کو بتا سکوں گا۔"

صبیحہ کھل اُٹھی۔ "یہ بڑا احسان ہوگا آپ کا۔"

"احسان کا ہے کا صبیحہ" —— میں صبیحہ سے تعارف کے بعد پہلی بار اسے مخاطب کرتے ہوئے "صاحبہ" کا لاحقہ گول کر گیا تھا اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔ اب

تو معاملہ صاف تھا۔

میں ٹکے ہوئے پلنگ پوش تک پہنچا تو وہ بولی۔ "اویس صاحب۔ سنیئے۔" میں رُک گیا۔ "کہیئے۔"

وہ میرے بہت قریب آگئی اور بولی "عُمر کا خاص خیال رکھیئے گا۔ سکون اور صفائی سے زندگی گزارنے کے لئے زندگی کا تجربہ بہت ضروری ہے۔ میں اکیس بائیس برس کی ہوں۔ اسے کم از کم اکتیس بتیس برس کا ضرور ہونا چاہیئے۔ میری آپ کی عُمر کے لڑکے عام طور پر بہت اتھلے ہوتے ہیں۔ ناتجربہ کار، نمائشی سے، لونڈے سے۔ سمجھ گئے نا آپ؟"

میں نے دیوار کا سہارا لے کر آنکھیں بند کر لیں۔ پھر سُورج جیسے چھت کو توڑ کر میرے سَر پر اتر آیا۔ سارا منظر لہولہو ہو رہا تھا اور وہ اس لہو کے سیلاب کو عبُور کرتی ہوئی دوسرے کمرے میں تحلیل ہو گئی تھی۔

۱۹۷۹ء

عورت صاحبہ

جب دوسروں کو نشہ ہوتا تھا تو کسی پر دُنیا کی بے ثباتی کی وجہ سے رقت طاری ہو جاتی، کوئی حاضر اور غائب لوگوں پر گالیوں کا طومار باندھ دیتا، کوئی استغراق میں چلا جاتا اور کوئی قریب بیٹھے ہوئے مرد یا عورت کے کندھے پر سَر رکھ کر سو جاتا، مگر امتیاز کے آؤٹ ہونے کا اعلان اس وقت ہوتا تھا جب وُہ اٹھتا اور لڑکھڑاتا ہوا یوں چلنے لگتا کہ اس کے پاؤں کا رُخ کسی طرف ہوتا اور چہرے کا رُخ کسی طرف۔ یوں وہ میزوں تپائیوں کو الٹتا، بوتلیں اور گلاس توڑتا کہیں سے کہیں جا گرتا۔

کلب کے ممبر کہتے تھے کہ امتیاز نہایت مہذب اور کلچرڈ جوان ہے۔ پھر وُہ کاروبار میں مہارت کے معاملے میں اپنے والد سیٹھ نواز احمد جی سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ اسے سب کچھ آتا ہے، صرف گرنا نہیں آتا اور وہ ٹھیک کہتے تھے۔ امتیاز یوں گرتا جیسے آسمان گرا ہو۔ وہ یہاں سے وہاں تک گرتا چلا جاتا اور ساتھ ساتھ پکارتا جاتا ــــ "عورت! اے عورت! اے عورت صاحبہ۔!"

تب ویٹر باہر جا کر سیٹھ صاحب کے ڈرائیور کو بلا لاتا اور امتیاز کو کار میں ڈال کر گھر پہنچا دیا جاتا۔

جب امتیاز یورپ سے واپس آیا تھا تو کلب میں آؤٹ ہونے کے بعد اس نے پورے کلب میں کھلبلی ڈال دی تھی۔ جس پہلی عورت پر اس کی نظر پڑی تھی وہ کلب کے ایک سینئر ممبر ماجد صاحب کی بیوی تھی۔ وہ جیسے ایک طلسم میں آ کر اس پر جھپٹا تھا اور اس ہنگامے میں کلب کی بہت سی کراکری ٹوٹ گئی تھی۔

دوسرے روز کلب کے سینئر ممبر سیٹھ صاحب کے پیلس میں حاضر ہوئے تو اتنی بہت سی کاروں میں اتنے ہجوم کو دیکھ کر سیٹھ صاحب کی بیگم اور بیٹی حیرت زدہ ہو کر برآمدے میں آ گئی تھیں مگر ماجد صاحب کے سمجھانے پر کہ یہ سیٹھ صاحب کا اور ہمارا پرائیویٹ معاملہ ہے، واپس چلی گئی تھیں۔

عام مکانوں کے رقبے سے بھی بڑے ڈرائینگ روم میں بیٹھ کر ممبروں نے سیٹھ صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ امتیاز کی فوراً شادی کر دیں کیونکہ وہ "عورت عورت" پکارتا پھرتا ہے۔

سیٹھ صاحب ہنسنے لگے "اچھی بات ہے۔ عورت کی طلب بہت زیادہ ہو تو شادی کامیاب رہتی ہے۔ اس طلب کو ابھی ذرا سا بڑھنے دیجئے۔"

سب ممبروں نے حواس باختہ ہو کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ایک ممبر بولا:

"تو آپ فی الحال اپنے صاحبزادے کو سمجھا دیجئے۔"

سیٹھ صاحب ہنسنے لگے۔ پھر بولے "سمجھاؤں؟ یعنی آپ سب ماشاء اللہ پینے والے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ مَیں پینے والے کو سمجھاؤں! بھئی نشہ تو سمجھ بوجھ کی باتوں سے چھٹکارا پانے کا ایک ذریعہ ہے۔ آپ جانتے ہیں میں نہیں پیتا مگر پینے والوں کے ساتھ زندگی بسر کی ہے۔ اس لئے میں آپ لوگوں کی نفسیات اچھی طرح سمجھتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سیٹھ صاحب" ماجد صاحب بولے "مگر ہم سب ماؤں، بیویوں، بہنوں اور بیٹیوں والے ہیں اور ہماری نفسیات کا ایک حصّہ ہمیشہ بیدار رہتا ہے۔ یہ غیرت کی نفسیات ہے۔ آؤٹ ہو جانے کے بعد بھی ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے کہ کوئی

ہمارے دومن فوک پر دست درازی کرے!"

"دست درازی!" سیٹھ صاحب سنجیدہ ہو گئے۔ "یہ تو بہت سخت لفظ ہے ماجد صاحب۔ امتیاز عورتوں سے آزادی کے ساتھ گپ لڑا سکتا ہے مگر دست درازی! یہ ناممکن ہے۔ آخر وہ میرا بیٹا ہے۔ اس کی رگوں میں میرا خون دوڑ رہا ہے شریف خون۔"

ماجد صاحب نے بھی اسی سنجیدگی سے عرض کیا: "سیٹھ صاحب، خون چاہے شریف ہو لیکن جب گرم ہو کر اُبلتا ہے تو شرافت کے سارے جراثیم مر جاتے ہیں اور نیچے سے ایک وحشی نکل آتا ہے ——— ڈریکولا!"

"اچھا تو آپ امتیاز کو وحشی اور ڈریکولا کہہ رہے ہیں۔" سیٹھ صاحب کو غصہ آ گیا۔

"جی نہیں سیٹھ صاحب"۔ ماجد صاحب بولے۔ "ہم نے انہیں ڈریکولا بننے سے بروقت روک لیا، ورنہ وہ میری بیوی کو چیرنے پھاڑنے کے لئے اسی نیت سے جھپٹے تھے۔ یہ سب دوست موجود تھے۔ ان سے پوچھ لیجئے۔"

سیٹھ صاحب نے سب پر ایک نظر دوڑائی۔ پھر بولے "کون سی بیوی تھیں آپ کی؟ پہلی یا دوسری؟ دوسری ہی ہوں گی۔ بہر حال معلوم ہوتا ہے امتیاز یورپ اور امریکہ کے قیام میں بھول گیا ہے کہ وہ کس ملک کا رہنے والا ہے اور کس معاشرے سے تعلق رکھتا ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ کلب جائے ہی نہیں۔ گھر میں ہر قسم کی وہسکی موجود ہے۔ یہیں پی پلا لے۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ایک ممبر بولا۔ "یہ کلب آپ ہی کی سخاوت سے چل رہا ہے۔ آپ نے یہاں ممبروں کے لئے اتنی سہولتیں جمع کر دی ہیں کہ سارا شہر اس کا ممبر بننا چاہتا ہے مگر وہ جو آپ نے کم سے کم بیس ہزار روپے ماہانہ کی آمدنی کی شرط لگا دی تھی، تو اس کی وجہ سے کوڑا کرکٹ باہر رہ گیا ہے اور شہر کی کریم اس کلب میں جمع ہو گئی ہے۔ جس طرح غالب اپنے دیوانِ غالب کی وجہ سے کبھی نہیں مر سکتا، اسی طرح یہ کلب آپ

کے نام کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ امتیاز صاحب پر زیادہ پابندیاں نہ لگایئے۔ ہماری درخواست یہ ہے کہ چند روز تک آپ بھی ان کے ساتھ آجایا کیجئے۔ آپ کی وجہ سے وہ حد سے نہیں بڑھیں گے اور پھر یہی ان کی عادت ہو جائے گی۔"

"بات معقول معلوم ہوتی ہے" سیٹھ صاحب کے خدوخال نارمل ہونے لگے۔ "آجاؤں گا" پھر وہ ماجد صاحب سے مخاطب ہوئے۔ "اگر امتیاز میاں سے کوئی زیادتی ہو گئی ہے تو انشاء اللہ وہ آپ سے معافی مانگے گا۔ دراصل وہاں ویسٹ میں تہذیب اور شرافت کا معیار ———"

ماجد صاحب ابھی تک تنے بیٹھے تھے۔ سیٹھ صاحب کو ٹوک دیا اور بولے: "ویسٹ کے معیار ہم سے مختلف سہی، مگر ابھی انہوں نے بھی اپنی بیویوں بیٹیوں کو نیلام کا مال نہیں بنایا۔"

سیٹھ صاحب نے چونک کر ماجد صاحب کی طرف دیکھا۔ ایک لمحہ مسلسل دیکھتے رہے، پھر بولے: "اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر امتیاز کو کلب جانا ہے تو مجھے بھی جانا چاہیئے اس کے ساتھ۔ آؤں گا ماجد صاحب۔ اگرچہ اس طرح میری نماز عشا بہت لیٹ ہو جائے گی مگر آؤں گا۔ کلب کو بدنام نہیں ہونا چاہیئے۔"

سب لوگ مطمئن ہو کر چلے گئے تو سیٹھ صاحب نے فون کر کے امتیاز کو اپنے مرکزی کاروباری دفتر سے بلایا اور اسے کلب کے سینئر ممبروں کے ساتھ گفتگو کا حال بتایا۔ پھر بولے: "اس کلب سے ہم نے بڑے بڑے فائدے اُٹھائے ہیں بیٹا، اگر اس وقت ہم ارب پتی ہیں تو یوں سمجھو کہ اس ارب میں آدھا کنٹری بیوشن اس کلب کا ہے جس کے ماحول میں پتھر موم ہو جاتے ہیں اور لوہا اتنا گرم ہو جاتا ہے کہ جدھر چاہو موڑ لو۔ میں اسے اپنی ملز اور اپنے امپورٹ ایکسپورٹ کمپلکس سے بھی زیادہ اہمیت دیتا ہوں۔ اس کی گڈوِل اتنی زبردست ہے کہ اچھے اچھے اس کی رُکنیت کے لئے ترستے ہیں۔ اسے

بدنام نہیں ہونا چاہیئے۔ کل تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"کیا اچھا نہیں کیا ڈیڈ؟" امتیاز حیرت سے بولا۔ "کیا ہوا تھا کل؟ کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔ بس ذرا سی زیادہ پی لی تھی۔"

"تم نے ایک سینئر ممبر ماجد کی بیوی سے زیادتی کرنا چاہی۔" سیٹھ صاحب نے اسے اطلاع دی۔

امتیاز کو کچھ یاد آیا۔ "اچھا تو وہ؟ ڈیڈ۔ آپ نے کبھی اسے دیکھا ہے؟ آپ نے کبھی صندل میں گوندھا ہوا جسم دیکھا ہے؟"

سیٹھ صاحب بڑے محظوظ ہوتے۔ "یہ ماجد کی دوسری بیوی ہے، بلکہ تیسری سمجھو۔ ایک مر بھی چکی ہے۔ خوبصورت تو وہ مبالغے کی حد تک ہے مگر وہ ماجد کی بیوی ہے۔ تم کیا کرنے چلے تھے اس کے ساتھ؟"

"اسے اس کے حسن پر مبارکباد دینے ڈیڈ۔" امتیاز بولا۔ "اسے بتانے کہ قدرت سے بھی ایسے ایسے شاہکار کبھی کبھار ہی تخلیق ہوتے ہیں۔"

"بات تو تم نے ذہانت کی کی ہے۔" سیٹھ صاحب محظوظ ہوتے جا رہے تھے۔ "مگر یہ مشرق ہے امتیاز۔ اور ینٹ، ایشیا اور پھر ایشیا جہاں اسلامی معاشرت چلتی ہے۔ تم ایچی سن میں اور پھر آکسفورڈ میں پڑھے اور کاروباری تجربے کے لئے یورپ اور امریکہ کا شہر شہر گھومے اور بھول گئے کہ تمہارا نام امتیاز احمد ہے تو کیوں ہے؟ اور میں سب سے چھپ کر پیتا ہوں تو کیوں پیتا ہوں۔ تمہیں آئندہ زندگی یہاں بسر کرنی ہے اور ہمارے کلب کو بدنام نہیں ہونا چاہیئے۔ پیو مگر تین چار پیگ سے زیادہ نہیں۔ میرا تو اتنے ہی میں کام ہو جاتا ہے۔ اگر محسوس کرو کہ توازن بگڑ رہا ہے، تو اُٹھ کر چلے آیا کرو۔ کل سے میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ تم پہلا کام یہ کرو گے کہ ماجد سے معافی مانگو گے۔"

امتیاز نے پوچھا۔ "مگر ڈیڈ میں یہ معافی مسز سے مانگ لوں تو کیسا رہے؟"

اس بات پر باپ بیٹا دیر تک ہنستے رہے اور ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے رہے۔

دوسرے روز سیٹھ صاحب بھی امتیاز کے ساتھ کلب پہنچے تو سب کے چہرے کھل اُٹھے۔ سیٹھ صاحب بیٹے کو لے کر ماجد صاحب کی میز پر گئے اور امتیاز کو اشارہ کیا، تو اس نے بڑی تمیز سے معافی مانگ لی مگر ساتھ ہی کہا: "مسز ماجد کہاں ہیں۔ میں اُن سے بھی معافی مانگ لوں۔"

ماجد صاحب بولے: "کل کے واقعے سے ان کے اعصاب شیٹر ہو گئے ہیں۔ ٹھیک ہوں گی تو آجائیں گی۔"

"ہاں، انہیں آنا چاہیئے۔" سیٹھ صاحب بولے۔ "اب کچھ نہیں ہوگا۔ کیوں امتیاز؟"

"جی ہاں ڈیڈ۔" امتیاز نے تائید کی۔ "ہونا کیا ہے!"

کلب کی زندگی معمول پر آگئی۔ امتیاز پیتا تو سیٹھ صاحب موجود رہتے اور چوتھے پیگ کے بعد اس کا گلاس اٹھا کر میز کے نیچے رکھ دیتے۔ امتیاز جھومتا ہوا مسکراتا اور سیٹھ صاحب اسے بازو میں سمیٹ کر لے جاتے۔ سب ممبر سیٹھ صاحب کی شرافت اور احساسِ ذمّہ داری کی تعریفیں کرتے اور ایک روز تو ماجد صاحب نے بھی کہہ دیا کہ اگر سب کیپٹیلسٹ سیٹھ صاحب کی طرح ہو جائیں تو سوشلزم اپنی موت آپ مر جائے۔

پھر ایک روز ماجد صاحب اپنی بیگم کو بھی ساتھ لے آئے۔ ان کے گرد مزاج پُرسوں کا ہجوم ہو گیا۔ سب حیران ہوتے رہے کہ نروس بریک ڈاؤن کے بعد مسز ماجد کی جلد کیسی چمکنے لگی ہے اور ان کی رنگت کے صندل میں کچھ ایسا اجالا سا کیا ہے جیسے ان کے اندر ٹیوب لائٹ ہو رہی ہے۔

سیٹھ صاحب موجود تھے۔ انہوں نے امتیاز کو چار پیگ کے بعد سمیٹا اور لے گئے۔ امتیاز نے مسز ماجد کو دیکھا ہی نہیں۔ ماجد صاحب نے بھی تو اب ہال کمرے کے

آخری کونے کی ٹیبل سنبھال لی تھی۔

ایک رات سیٹھ صاحب نے ایک سینئر ممبر کے پاس جاکر اعلان کیا کہ اب امتیاز ایشیائی معاشرے میں شراب کے آداب سیکھ گیا ہے اور انہوں نے اسے فرسٹ ڈویژن میں پاس کر دیا ہے۔ اس پر دیر تک قہقہے پڑتے رہے اور مسز ماجد اور ماجد صاحب یوں مسکراتے رہے جیسے یہ سارا کارنامہ انہی کی تحریک سے ہوا ہے۔

اب سیٹھ صاحب نے کلب آنا بند کر دیا۔ امتیاز اکیلا آتا، مگر چار پیگ کی حدبندیاں پھلانگ کر کہیں سے کہیں نکل جاتا۔ آؤٹ ہوتے ہی وہ اُٹھتا اور گرتا پڑتا۔ دائرے بناتا، میزوں تپائیوں کو الٹتا کرسیوں کو گھسیٹتا یہاں سے وہاں پکارتا پھرتا —— "عورت۔ اے عورت۔ اے عورت صاحبہ!"

عورتیں کلب میں موجود ہوتیں، مگر امتیاز کا عورت کو پکارنے کا انداز اتنا بے تخصیص اتنا ایبسٹرکٹ ہوتا تھا کہ سب اپنے اندر احساس تفاخر بھی محسوس کرتیں اور اس کی حرکتوں پہ ہنسنی بھی چلی جاتیں۔

مگر چند دنوں کے بعد یوں ہوا کہ امتیاز آؤٹ ہونے کے بعد اپنی نشست سے اُٹھا لڑکھڑاتا پڑتا گھومتا، دائرے بناتا اور "عورت عورت" پکارتا ماجد صاحب کی ٹیبل کے پاس جا پہنچا۔ عورتوں نے امتیاز کی معمول کی حرکات پر ابھی ہنسنا ہی شروع کیا تھا کہ امتیاز مسز ماجد کے سر پر جا کھڑا ہوا اور سارا کلب سناٹے میں آگیا۔

ماجد صاحب سُرخ چہرہ لئے اُٹھ کھڑے ہوتے۔ "فرمایئے۔"

"عورت۔" امتیاز مسکرایا۔ اس کی آنکھیں آدھی سے بھی کم کھل رہی تھیں۔

"عورت!" ماجد صاحب کڑکے۔ "کون سی عورت؟"

"کوئی بھی عورت۔" امتیاز بولا۔ "بس ایک عورت۔ ٹائم پاس کرنے کے لئے۔" پھر اس نے جھک کر مسکراتے ہوئے مسز ماجد کو مخاطب کیا۔ "اے عورت صاحبہ!"

ممبر جمع ہونے لگے۔ ماجد صاحب آگے بڑھے اور امتیاز کو دونوں کندھوں سے پکڑ کر بولے "یہ عورت میری بیوی ہے مسٹر امتیاز۔ اگر آپ کو عورت کی ایسی ہی طلب ہے، تو آیئے میں آپ کو عورت بلکہ عورتوں کے پاس لئے چلتا ہوں۔"

"چلیئے،" امتیاز قدم اُٹھانے کی کوشش میں لڑکھڑایا۔ "مگر ایک شرط۔"

"کیا شرط ہے؟" ماجد صاحب نے پوچھا۔

"شرط یہ کہ جو بھی عورت ہو، ایسی ہی فرسٹ کلاس عورت ہو۔" امتیاز نے مسز ماجد کی طرف انگلی اٹھائی اور دیر تک اُٹھائے رکھی۔

"اس سے بھی بڑھیا۔" ماجد صاحب بولے۔ "آیئے"

اور ماجد صاحب کی گرفت میں آیا ہوا امتیاز دُور تک حیرت کا اظہار کرتا گیا۔ "اس سے بھی بڑھیا! کیا اس سے بھی بڑھیا کوئی ہو سکتی ہے؟ نہیں ہو سکتی۔ نہیں ہو سکتی ہے"

"ہو سکتی ہے۔ ہو سکتی ہے،" ماجد صاحب اسے کھینچے لئے جا رہے تھے اور سارا کلب ہکا بکا کھڑا دیکھ رہا تھا کہ ماجد صاحب یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں اور کیا کرنے والے ہیں۔

ماجد صاحب نے امتیاز کو بڑی مشکل سے اپنی کار میں بٹھایا۔ امتیاز سارے رستے ماجد صاحب کو چومتا رہا اور ان کی گردن میں بازو ڈال کر ان سے اظہار محبت کرتا رہا۔

ماجد صاحب کی کار سیٹھ نواز احمد جی کے محل میں داخل ہوئی اور پورچ میں رک گئی۔ پھر کار سے اترتے ہوئے ماجد صاحب نے امتیاز سے کہا "میں ابھی آتا ہوں یا آپ کو ابھی بلاتا ہوں۔"

"ویسی ہی ہو ماجد ڈیئر۔" امتیاز عجیب سرخوشی کے عالم میں تھا۔ "آپ کی مسز کی سی صندل میں گندھی ہوئی۔"

"انشاء اللہ۔" ماجد صاحب بولے۔ "آپ جب تک ذرا سا سو لیجئے۔"

ماجد صاحب نے سیٹھ صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہیں ڈرائینگ رُوم میں بٹھایا گیا۔ سیٹھ صاحب اندر کسی کمرے میں شاید پی رہے تھے مگر سَر پر یوں رومال باندھ رکھا تھا جیسے نماز پڑھ رہے تھے۔ گھبراتے ہوئے آئے ”کیا بات ہے ماجد صاحب۔ رات کو، اس وقت؟“

”کوئی خاص بات نہیں سیٹھ صاحب“ ماجد صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے ”ایک چھوٹی سی بات ہے۔ اگر آپ بیگم صاحبہ اور اپنی صاحبزادی کو بھی بلالیں تو بڑا کرم ہوگا۔“

سیٹھ صاحب بولے ”یقیناً یقیناً“ مگر پھر رُک گئے ”کوئی نازک بات معلوم ہوتی ہے؟“

”جی نہیں۔ اتنی نازک بھی نہیں“ ماجد صاحب بولے۔

سیٹھ صاحب سوچتے ہوئے چلے گئے۔ پھر اپنی بیوی اور بیٹی کے ہمراہ واپس آئے۔ دونوں شب خوابی کے لباس میں تھیں مگر انہوں نے بڑی بڑی چادریں اوڑھ لی تھیں۔ ان کے چہروں پر تشویش تھی۔

”میں ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں“ ماجد صاحب باہر لپکے۔

پھر وہ امتیاز کو سہارا دیئے ڈرائینگ رُوم میں واپس آئے۔ اسے ایک صوفے پر بٹھایا اور بولے ”یہ لیجئے مسٹر امتیاز۔ میں نے اپنا وعدہ پُورا کیا۔ یہ ہیں آپ کی بہن اور یہ ہیں آپ کی ماں۔ یہ دونوں بھی عورتیں ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟“

امتیاز دیوانوں کی طرح ماجد صاحب کو دیکھتا رہا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر بچّوں کی طرح بلک بلک کر روتا ہوا صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کی ماں، بہن اور باپ اس کی طرف بڑھے اور ماجد صاحب نے سینہ پھلا کر اپنے پھیپھڑے یوں بھر لئے جیسے مدّت سے ہوا کو ترس رہے تھے۔

۱۹۷۹ء

جُوتا

کرمُوں ایک قوال پارٹی میں برسوں تک تالی بجا بجا کر تال دیتا رہا۔ پھر آواز لگانا بھی سیکھ گیا۔ پیچھے سے آگے آگیا اور بڑے قوال کے گھٹنے سے گھٹنا ملا کر بیٹھنے لگا۔ تب بڑے قوال کو تشویش لاحق ہوگئی کہ کہیں وہ اس سے بھی آگے نہ نکل جائے چنانچہ اس نے کرموں کو چلتا کر دیا۔ کرموں کی آواز تو واجبی سی تھی مگر اس نے قوالی کے گُر سیکھ لئے تھے اور ہارمونیم کی آواز میں اپنی آواز چھپا لینے کی مہارت حاصل کر چکا تھا۔ اس نے اپنی قوالی پارٹی بنالی اور عرسوں، میلوں اور شادی بیاہ کے جمگھٹوں میں گاتا رہا اور اپنے تینوں بچوں کو پڑھاتا رہا۔ دراصل بڑے قوال کے ساتھ اسے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں جانے کا موقع ملا تھا اور اس نے محسوس کیا تھا کہ اگر اس نے اپنے بچّوں کو تعلیم نہ دی تو وہ اس کی طرح اور اس کے باپ دادا کی طرح ڈھول شہنائی بجاتے یا قوالوں کے پیچھے بیٹھے تالیاں پیٹتے پھریں گے اور اس کی طرح اور اس کے باپ دادا کی طرح ان کی باچھیں بھی ہمیشہ ڈھیلی رہیں گی۔

جب اس نے تینوں بچوں کو گاؤں کے سکول میں داخل کرایا تھا تو سارا گاؤں جیسے سنّاٹے میں آگیا تھا۔ لوگ کہتے تھے، حضرت آدم کے آسمان سے زمین پر اترنے سے لے کر اب تک کے زمانے کا یہ پہلا میراثی ہے جسے اپنے بچّوں کو تعلیم

دینے کی سوجھی ہے۔ چودھری نے اُسے دارے پہ بُلایا اور ڈانٹا۔ "شرم کرو کرموں میراثی ہو کر اپنے بچّوں کو پڑھاتے ہو؟ کیا شادیوں میں اُن سے لوگ ڈھول شہنائی کی بجائے کتابیں سنیں گے؟ کیوں بگاڑتے ہو انہیں؟ کیوں ناس مارتے ہو اپنے نسلی پیشے کا؟"

کرموں یہ سب سُنتا رہا اور چپکا رہا۔ البتہ مُسکراتا رہا۔ چودھری کی اس ڈانٹ پر کہ اب کچھ بکو بھی، اس نے کچھ کہا تو بس اتنا کہ ——— "اقبال قائم۔ عمر بھر دال، ساگ کھانے والے کا بھی ایک آدھ بار مرغ، بٹیر کا سالن چکھنے کو جی چاہتا ہی ہے۔"

کرموں نے قوالی کے نام پہ چیخیں اور بڑھکیں مار مار کر پیسہ جمع کیا اور بچّوں کو یوں پڑھایا کہ وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں گاؤں آتے تھے تو میراثی کی اولاد لگتے ہی نہیں تھے۔ پھر وہ نہ جانے کیا پٹی پڑھ کر آتے تھے کہ میراثی کے بیٹے ہونے سے شرماتے بھی نہیں تھے۔ "ٹھیک ہے۔ ہم کرموں میراثی کے بیٹے ہیں مگر چودھری کی طرح ہماری پیڑھی بھی تو حضرت آدم ہی سے ملتی ہے۔"

پھر یہ لڑکے ادھر لاہور، کالا شاہ کاکو اور فیصل آباد کی طرف ملوں میں ملازم ہو گئے اور باپ کو ہر مہینے اتنا بہت سارو پیہ بھیجنے لگے کہ کرموں اپنی قوال پارٹی توڑ کر اپنے گھر میں رہنے لگا اور صاف ستھرے کپڑے پہننے لگا اور خیرات دینے لگا اور پھر ایک سال اس نے زکوٰۃ تک نکالی۔ چودھری نے یہ سنا تو اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا ——— "حرام کی اولاد!" اس نے کہا۔ "اتھلا کمینہ کہیں کا۔ دیکھ لینا لوگو، سال دو سال میں خود زکوٰۃ مانگنے نکل کھڑا ہو گا۔ اگر اس وقت تک قیامت نہ آگئی تو۔ ایک میراثی جب زکوٰۃ دینے لگے تو سمجھو سورج سوا نیزے پہ اترنے کو ہے۔" اور چودھری پھر یوں ہنسنے لگا جیسے رونے لگا ہے۔

کسی نے کرموں کو چودھری کی یہ بات بتائی تو وہ بولا۔ "چودھری کیوں خفا ہو رہا ہے۔

میں نے اسے تو زکوٰۃ نہیں بھجوائی۔ اسے بھی دیتا مگر ابھی زکوٰۃ لینے کا حق نہیں بنتا اس کا۔ آہستہ آہستہ حقدار ہو جائے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے۔"

جن لوگوں نے کرموں کو چودھری کی بات بتائی تھی انہوں نے چودھری کو کرموں کی بات بتانا بھی ضروری سمجھا۔ اس وقت چودھری شربت پی رہا تھا۔ یہ بات سنی تو اسے اچھو ہو گیا اور شربت اس کی ناک سے بہنے لگا۔

پھر ایک روز کرموں گلی میں بیٹھا لوگوں سے گپ ہانک رہا تھا۔ باتوں باتوں میں کہنے لگا۔ "میں میراثی ہوں پر تین بابو لوگوں کا باپ بھی ہوں اس لئے جی چاہتا ہے یہاں گلی میں بیٹھنے کی بجائے ایک پکّی بیٹھک بنوا لوں۔ اس میں پلنگ اور مونڈھے بچھا دوں اور تم سب کے ساتھ بیٹھ کر دُنیا جہان کی اچھی اچھی، پیاری پیاری میٹھی میٹھی باتیں کروں۔ بیٹھنے کے لئے چودھری کا دارا تو ہے مگر میں وہاں بیٹھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے سَر کے بل کھڑا ہوں۔"

یہ بات کر کے وہ اپنے گھر گیا۔ حقّہ تازہ کیا۔ چلم پر آگ سجائی اور کش لگانے کے لئے چارپائی پر ابھی بیٹھا ہی تھا کہ چودھری کی طرف سے اسے بلاوا آگیا۔ اس نے دارے پہ قدم رکھا ہی تھا کہ تین چار مسٹنڈوں نے اسے دبوچ کر گرا دیا اور چودھری کا پلا ہوا منشی اس کی پیٹھ پر جوتے برسانے لگا۔ ساتھ ساتھ چودھری اسے گالیاں دیتا رہا اور کہتا رہا۔ "بیٹھک بنائے گا کمینہ؟ دارا لگائے گا میری طرح؟ چار پیسے کیا آگئے کہ اپنی اوقات ہی بھول گیا رذیل۔ لگاؤ۔ اور لگاؤ۔"

کرموں کو اتنے جوتے لگے کہ اگر کسی اور کو لگتے تو وہ گنتی بھول جاتا، مگر کرموں گنتا رہا ——— "میں تو گنتا رہا۔" اس نے اپنے ملنے والوں کو بتایا۔ "میں تو گنتا رہا تا کہ قیامت کے دن خُدا کے سامنے جوتوں کا حساب چکانے میں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ باسٹھ لگے تھے۔ باسٹھ پورے کروں گا خدا کے حضور انشاء اللہ۔ ایک کے ستر نہ سہی۔ چودھری کے لئے تو میرا ایک ہی جوتا بہت ہے سارے جہان کی مخلوق کے سامنے۔"

انہی دنوں ووٹ درج ہو رہے تھے۔ ووٹ درج کرنے والے اس گاؤں میں بھی آتے اور کرموں کا ووٹ بھی درج کرنے لگے۔ تب ان میں سے ایک بولا۔ "بھئی تم اپنا نام کرما بتاتے ہو مگر کرما کیا نام ہوا! کرم الٰہی ہوگا، یا کرم علی یا کرم دین۔ کرما کوئی نام نہیں ہوتا۔ یہ تمہارے اصلی نام کا بگاڑ معلوم ہوتا ہے۔"

کرموں بولا۔ "میں میراثی ہوں جی، اور میراثیوں کے نام ایسے ہی ہوتے ہیں۔ میرے نام کا بگاڑ تو کرموں ہے جیسے میرے باپ کو لوگ گاموں کہتے تھے پر اس کا اصلی نام گاما تھا۔"

زچ ہو کر انہوں نے فہرست میں "کرما ولد گاما ذات میراثی پیشہ گداگری" کے الفاظ لکھے تو کرموں بگڑ گیا۔ "نہیں صاحب جی۔ میں گداگر نہیں ہوں۔ گدا کا ایک پیسہ بھی مجھ پر حرام ہے۔ مَیں تو عمر بھر اپنی محنت کی کمائی کھاتا رہا۔ میرے بچے پڑھ لکھ گئے تو یہ بھی میری محنت کی کمائی ہے۔ اب وُہ محنت کرتے ہیں اور میری محنت کا بدلہ چکاتے ہیں۔ میں تو اب زکوٰۃ بھی نکالتا ہوں۔ پھر میں گداگر کیسے ہو گیا۔ گداگری اتنی سستی ہے تو چودھری کو گداگر لکھو کہ کسان محنت کرتا ہے اور چودھری کھاتا ہے۔"

چودھری کو خبر ملی کہ کرموں نے ووٹ درج کرنے والوں کے سامنے اسے گداگر کہا ہے۔ اسے فوراً ڈارے پر بُلایا گیا اور سب گاؤں والوں کے سامنے چودھری نے اپنے منشی سے اسے جُوتے لگوائے۔ جوتے لگ رہے تھے جب کرموں اچانک اُٹھ بیٹھا اور منشی کی کلائی جکڑ کر بولا۔ "بس باسٹھ پُورے ہو گئے۔ میرا کوٹہ مجھے مل گیا۔ زیادہ لگاؤ گے تو قیامت کے دن چودھری جی کو زیادہ تکلیف ہو گی۔"

"مجھے تکلیف ہو گی!" چودھری یوں حیران رہ گیا جیسے اس کے سر پہ سورج گر پڑا ہے۔ "مجھے کیسے تکلیف ہو گی کمینے؟"

کرموں کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ بولا۔ "چلئے آپ کو تکلیف نہیں ہو گی تو آپ کا حساب پُورا کرنے والے فرشتے کو تکلیف ہو گی۔"

"میرا حساب؟" چودھری نے اس طرح پہلو بدلا جیسے پلنگ ہی پہ کھڑا ہو جائے گا۔ "کیا بکتے ہو؟ میرا حساب کیسا؟"

"جی یہی، غریبوں کو جُوتے لگوانے کا حساب۔ ایک کے ستر۔" کرموں مزید جوتوں کا انتظار کئے بغیر اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور زمین پر سے اپنی پگڑی اٹھا کر اسے جھاڑ رہا تھا۔ "اب آپ خود حساب لگا لیجئے اقبال قائم، کہ باسٹھ یہ جوتے اور باسٹھ وہ پچھلے کل ہوئے، خدا آپ کا بھلا کرے، ایک سو چوبیس۔ قیامت کے دن اگر ایک کے ستر لگیں گے تو ایک سو چوبیس کے کتنے لگیں گے۔ منشی جی، حساب لگا کر بتا دو چودھری جی کو۔"

چودھری نے غصّے میں اپنے جُوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر جب دیکھا کہ ڈارے پر موجود بیشتر لوگ کرموں کی باتوں پر دانت نکالے کھڑے ہیں تو ہاتھ واپس لانے کی بجائے اس نے زمین پر سے ایک تنکا اٹھایا اور اسے اپنی پوروں میں یوں مسلا کہ وہ سفوف سا بن کر رہ گیا۔ گالیاں اس کے ہونٹوں پر کپکپاتی رہ گئیں۔

اس وقت پرندے واپس آشیانوں کو جا رہے تھے۔ شام قریب تھی۔

چودھری اس واقعے کے بعد کرموں سے بہت سنبھل کر بات کرنے لگا۔ کرموں میراثی تو تھا مگر کھاتا پیتا میراثی تھا اور کھاتے پیتے لوگ کھاتے پیتے لوگوں سے بات ہمیشہ سوچ سمجھ کر کرتے ہیں، جیسے امریکہ رُوس سے اور رُوس امریکہ سے بات کرتا ہے۔ تاہم جب چودھری کے ڈارے پر سے فالتو لوگ اُٹھ جاتے اور صرف اس کے قریبی لوگ باقی رہ جاتے تو وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑتا۔ "اب یہ کمینہ کڑوی گولی کو تھوک دیتا ہے۔ اب میں اسے شکر چڑھی گولیاں کھلاؤں گا۔" پھر وہ حالات کے طویل تجزیے میں مصروف ہو جاتا۔ "لوگ کہتے ہیں شراب کا نشہ بُرا ہوتا ہے۔ میں کہتا ہُوں نو دولیتوں کے لئے روپے کا نشہ اس سے بھی بُرا ہے۔ کرموں کو دیکھو۔ کہاں تو جب بھی مجھے یہ میراثی زادہ

ملتا تھا، اقبال قائم، اقبال قائم کی رٹ لگاتا ہوا رکوع میں چلا جاتا تھا، اور کہاں یہ دن کہ کل کہنے لگا ـــــ میں ادھر لاہور، فیصل آباد کی طرف جا رہا ہوں۔ کوئی چیز چاہیئے تو لیتا آؤں، کوئی چھڑی وڑی، کوئی جوتا ووتا! یہ سب روپے کا نشہ ہے۔" پھر چودھری نے گردن کو کھینچنے کی حد تک کھینچ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا "کہیں وہ کسی کونے کھدرے میں بیٹھا تو نہیں ہے حرام کی اولاد۔ یاد ہے ایک بار میں یہیں دارے پہ اسی کی باتیں کر رہا تھا اور اندھیرے میں مجھے پتہ نہ چلا تھا کہ وہ کمینہ بھی ایک طرف بیٹھا ہے؛ میں نے اس نسلی کنگلے کے نئے ٹھاٹھ کی بات کرتے ہوئے کہہ دیا کہ کوّا اگر مور کے پَر سجالے تو بھی کوّا ہی رہتا ہے۔ اس پر وہ۔ میری چلمیں بھرنے والا ـــــ میرے اصطبل صاف کرنے والا ـــــ بھرے دارے میں بولا "ویسے چودھری جی۔ سیانوں سے سُنا ہے کہ مور بھی کوّے ہی کی نسل میں سے ہے۔ صرف رنگ دار پَر نکال لئے ہیں اور ناچنا سیکھ گیا ہے!" ـــــ یاد ہے نا؛ روپے نے اتنے حوصلے بڑھا دیئے ہیں اس افلاطون کے پٹھے کے، ورنہ یہاں میرے سامنے بلّی کی طرح منمناتا پھرتا تھا۔ روپے نے اس کی زبان کھینچ کر میرے جوتے بھر کی کر دی ہے۔ مگر مجھے بھی ایسے نو دولتیوں کو آپے میں رکھنے کے گُر معلوم ہیں۔ جوتے پر چاہے سنہرا کام ہوا ہو، رہے گا تو وہ جوتا ہی۔ اور پاؤں ہی میں پہنا جائے گا۔ اس میراثی کے بچے کو میرے گاؤں میں رہنا ہے تو میراثی بن کر رہنا ہو گا۔ دیکھ لینا۔"

سردیوں کے دِن تھے۔ کرموں چند روز اپنے بیٹوں کے ہاں گزار کر واپس آیا تو اس نے سنہرے رنگ کا کمبل اوڑھ رکھا تھا۔ لوگ اس کمبل کو چھوتے تو حیران رہ جاتے کہ کیا کسی بھیڑ کی اُون اتنی نرم بھی ہو سکتی ہے! کرموں کے ایک رشتہ دار نے اس کمبل کو چھُوا تو بسم اللہ پڑھ کر کمبل کا کونا منہ میں ڈال لیا اور بولا "سوجی کا حلوہ ہو تو ایسا ہو کہ جب جی چاہا اوڑھ لیا، جب جی چاہا کھا لیا۔"

خود کرموں ملنے والوں کو بتا تا رہا کہ پُورے ایک سو کا ہے۔" اور پھر صرف خوبصورت ہی نہیں ہے۔ اندر سے بھی بڑا گُنی ہے۔ باہر برف گر رہی ہو تو کمبل میں انگیٹھی سی دہکتی رہتی ہے ـــــ پوہ کی ٹھنڈ میں بھی پسینہ آنے لگتا ہے پنجتن پاک کی قسم!"

پُوری بستی میں اس کمبل کے چرچے ہونے لگے۔ بات چودھری تک بھی پہنچی مگر یُوں کہ کرموں کہہ رہا تھا ـــــ "ایسا کمبل تو چودھری کو بھی نصیب نہیں ہوا ہو گا" ـــــ اس پر چودھری یوں مُسکرایا جیسے کسی نے خربوزے کا ایک سرا چھُری سے چیر دیا ہے۔ کرموں کے روپے نے چودھری کو سیاستدان بنا دیا تھا۔

ایک دِن کرموں یہ کمبل اوڑھے چودھری کے دارے کی گلی میں سے گزرا تو چودھری اپنے آدمیوں کے ساتھ باہر بیٹھا دھوپ سینک رہا تھا۔ کرموں کو بُلایا اور اس کے کمبل پر ہاتھ پھیر کر بولا "کہاں سے مارا؟"

کرموں پاس ہی ایک سِل پر بیٹھ گیا۔ "میں نے تو ـــــ اقبال قائم ـــــ ساری عُمر میں ایک پتّہ اتک نہیں مارا، کمبل کہاں سے ماروں گا۔ اور پھر کمبل بھی ایسا کہ آپ نے بھی چھُوا تو میں نے آپ کے رونگٹے کھڑے ہوتے دیکھے۔"

چودھری کا چہرہ کچھ یوں تن گیا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ خربوزے میں ایک اور چیر پڑا اور چودھری بولا "چلو مارا نہیں تو لیا کہاں سے؟"

کرموں نے جواب میں لمحہ بھر دیر کی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔ اپنے بیٹوں کے ذکر پر ہمیشہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی پتلیوں میں رکھے ہوئے چراغوں کی لویں جل اُٹھی ہیں "کالا شاہ کاکو میں میرا بیٹا ہے نا سرفراز ـــــ"

"ہاں ـــــ وہ سرفا!" چودھری نے کرموں کی تصحیح کی۔

"جی ہاں۔ وہی سرفراز۔" کرموں نے اپنی غلطی کی تصحیح کو کوئی اہمیت نہ دی۔ "وہ کہنے لگا کہ بابا۔ اب کے یہاں سے ایک اچھا سا جُوتا لے جاؤ۔ میں نے کہا، بیٹے۔ جُوتے

ادھر گاؤں میں بہت ہیں۔ کچھ اور لا دو۔ کوئی تحفہ چیز۔ وہ یہ کمبل لے آیا۔ ملیشیا میں اس کے کسی دوست کا ابا رہتا ہے۔ وہ یہ کمبل اپنے بیٹے کے لئے لایا۔ سرفراز نے اس سے اپنے ابا کے لئے خرید لیا۔"

چودھری بولا۔ "دیکھو کرموں۔ اگر میں کہوں کہ مجھے یہ کمبل چاہیئے ـــــ تو ـــــ؟"

"تو لے لیجئے نا اقبال قائم۔" کرموں نے گرج کر جواب دیا۔ "سرفراز پوچھے گا تو کہہ دوں گا کہ چور لے گئے۔"

چودھری نے کرموں کی بات زور کے ایک قہقہے میں اُڑانے کی کوشش کی مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس قہقہے کا پھیپھڑوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر وُہ ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔ "اس کا کیا لو گے؟"

"کچھ بھی نہیں اقبال دائم۔" کرموں کی آواز میں بڑی آسودگی اور بے نیازی تھی۔

"مگر میں مُفت نہیں لوں گا۔" چودھری بولا۔ "یہ ہماری خاندانی عادت ہے کہ ہم مفت چیزیں دیتے ہیں، لیتے نہیں ہیں۔ تم تو جانتے ہو۔ تمہیں تو عمر بھر کا تجربہ ہے۔"

"جی ہاں۔" کرموں نے کہا۔ "پر کبھی کبھی لینے والوں پر دینے کا وقت بھی آ جاتا ہے اقبال قائم۔ لے لیجئے نا۔ سرفراز مجھے اور بھیج دے گا۔"

"نہیں کرموں۔" چودھری بولا۔ "تم ہمارے میراثی ہو۔ تمہارے باپ دادا نے ہمارے بزرگوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں۔ مانگو کیا مانگتے ہو اس کمبل کا۔ سرفے نے تمہیں بتایا تو ہوگا کہ اس نے کمبل کے کتنے روپے دیئے تھے۔"

"جی ہاں سرفراز نے بتایا تو تھا۔" کرموں کی آواز میں منصوبہ سازی کی گہرائی تھی۔ پھر وہ جیسے ایک نتیجے پر پہنچ کر مسکرانے لگا اور بولا۔ "کمبل دوسرے ملک کا ہے نا جی۔ میں نے کہا بھی سرفراز سے کہ اتنی فضول خرچیاں مت کیا کرو۔ بولا۔ کوئی بھی چیز ہمارے ابا کے آرام سے مہنگی نہیں ہے۔ آپ ٹھیک کہتے تھے تعلیم نے لڑکوں کے دماغ بگاڑ دیئے ہیں اقبال قائم ـــــ قیمت کچھ زیادہ ہی ہے۔"

"یعنی اتنی زیادہ ہے کہ سرفا میراثی یہ قیمت ادا کر سکتا ہے اور میں نہیں کر سکتا؟" ـــــ چودھری اپنے غصّے کو چھپانے کی کوشش کے باوجود پُوری طرح نہ چھپا سکا۔ "بتاؤ کتنے میں آیا ہے۔ پچاس، سو، دو سو، تین سو ـــــ کتنے ہیں؟"

"تین سو تو خیر نہیں جی۔" کرموں نے چودھری کے منشی کی طرف یوں دیکھا جیسے جوتے لگانے سے پہلے منشی نے کرموں کو دیکھا تھا۔ "کُل دو سو باسٹھ میں آیا ہے۔" اس نے حاضرین پر داد طلب نظریں ڈالیں۔

"اور اتنی رقم تمہارے بیٹے نے ادا کر دی؟"

"کماتا کھاتا ہے نا اقبال قائم۔"

"تو تم مجھ سے دو سو باسٹھ روپے لو گے؟"

"آپ باسٹھ رہنے دیجئے۔ ان کا حساب پھر ہوتا رہے گا۔ دو سو دے دیجئے۔"

"دو سو باسٹھ میں باسٹھ اور ملا کر کیوں نہ دوں؟" چودھری نے فاتحانہ انداز سے کہا۔ "آخر تم ہمارے میراثی ہو۔"

"چلئے زیادہ دے دیجئے اقبال قائم ـــــ تین سو بیس دے دیجئے۔"

"تمہیں تو دکانداروں کی طرح ٹھیک ٹھیک حساب کرنا بھی آ گیا!" چودھری نے دل لگی کرنے کی کوشش کی۔

اور کرموں کمبل اتارتے ہوئے بولا۔ "میں تو اب بے حسابا خرچ کرتا ہوں اقبال قائم۔ بس کچھ آتا ہے تو یہ باسٹھ کا حساب آتا ہے۔"

چودھری نے کرموں کے چلائے ہوئے چابک سے بے نیاز ہو کر اپنے منشی سے کہا۔ "لو بھئی دے دو اسے تین سو چوبیس۔"

"روپے منشی جی۔ تین سو چوبیس روپے!" روپے کے لفظ پہ زور دیتے ہوئے

کرموں نے منشی کو تاکید کی۔

"روپے نہیں تو پیسے؟" منشی نے قمیض کے نیچے پہنی ہوئی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سے نوٹوں کا ایک گٹھا نکالتے ہوئے پوچھا۔

"میرا مطلب تھا کہیں آپ تین سو چوبیس روپے دینے کی بجائے تین سو چوبیس جُوتے لگانے نہ بیٹھ جائیں۔"

چودھری سمیت سب لوگ زور سے ہنسے مگر سب کی ہنسی کا مفہوم الگ الگ پہچانا جا سکتا تھا۔ چودھری تو یوں ہنسا جیسے اس کا سینہ ٹین کی ایک چادر ہے جس پر کنکروں سے چاند ماری ہو رہی ہے۔

کرموں نے روپے لئے اور مسکراتا ہوا چلا گیا۔

تب چودھری اپنے سامنے کمبل پھیلوا کر مسکرایا۔ اسے خُوب اچھی طرح جھڑوایا جیسے کمبل کا میراثی پنا نکال رہا ہے۔ اسے تہ کرا کے منشی کے حوالے کیا کہ گھر پہنچا دو۔ "کہنا اسے دن بھر دھوپ دکھائیں اور پھر کسی پیٹی میں پھینک دیں۔" پھر وہ حاضرین سے مخاطب ہوا۔ "درجنوں پڑے ہیں اس طرح کے کمبل۔ مگر میں دو پیسے کے میراثی کو ڈھائی تین سو روپے کا کمبل اوڑھے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جوتے کو پاؤں ہی میں رہنا چاہیئے۔"

۱۹۷۹ء

اندمال

پاکستان کے اس ہوائی اڈے پر اترنے کا احساس بالکل اس احساس کے مشابہ تھا جو آج سے چوبیس سال قبل پہلی بار ڈھاکے کے ریلوے سٹیشن پر اُترتے ہوتے اس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔ پھر اس دوران میں جلال الدین نے ڈھاکے سے یہاں تک اور یہاں سے ڈھاکے تک کتنی بہت سی پروازیں کی تھیں پہلے چار گھنٹے کا سفر تھا۔ پھر تیز رفتار طیارے آئے تو وہ ڈھائی گھنٹے میں مشرقی پاکستان سے مغربی پاکستان پہنچ جاتا تھا، مگر آج وہ ڈھاکے سے چل کر ڈھائی مہینے بعد مغربی پاکستان کے اس ہوائی اڈے پر اتر رہا تھا۔ اب کے وطن کے ایک حصے سے وطن کے دوسرے حصے تک پہنچنے کے لئے اسے پورا جنوبی ایشیا طے کرنا پڑا تھا۔ ڈھاکے سے کلکتہ، وہاں سے پٹنہ، پھر کھٹمنڈو، کھٹمنڈو سے بنکاک اور بنکاک سے یہاں! اس نے سوچا بعض آزادیاں بظاہر کیسے ناقابلِ فہم شارٹ کٹ سے ایک دم آ دھمکتی ہیں مگر اس سے ملک کے ایک قریے سے دوسرے قریے تک کے فاصلے کتنے بڑھ جاتے ہیں۔

طیارے کی کھڑکی میں سے جلال الدین نے دیکھا کہ سیڑھی طیارے کی طرف لائی جا رہی ہے اور ہوائی اڈے کی دوسری منزل پر، جنگلے کے ساتھ ساتھ، لوگوں کی قطاروں کی آنکھیں طیارے کے دروازے پر گڑی ہوئی ہیں کہ کب سیڑھی لگے، دروازہ کھلے

اور اس میں سے ان کے پیاروں کے مانوس چہرے نمودار ہوں۔

مسافر اپنے اپنے بیگ اور بریف کیس سنبھال کر اُٹھ کھڑے ہوئے تھے مگر جلال الدین دور جنگلے کے ساتھ لگے ہوئے مردوں اور عورتوں کے چہروں کو بغور دیکھ رہا تھا کہ شاید طاہر کو کسی طرح اس کی آمد کا علم ہو گیا ہو۔ دور سے ان چہروں کے خطوط واضح نہیں تھے۔ سب ایک جیسے لگتے تھے۔ اور پھر اچانک اس کے اندر جیسے ایک انار سا چھُوٹا اور سارے چہرے روشن ہو گئے۔ وہ مسکرانے لگا۔ وہ ان سب کو جانتا تھا۔ وہ سب طاہر تھے۔ وہ سب پاکستانی تھے۔ اس کے جی میں یہ تمنا امڈ پڑی کہ وہ دروازہ کھلنے کا انتظار کئے بغیر کھڑکی میں سے کسی طرح باہر لٹک جائے اور ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا ہوا، ہوائی اڈے کی دوسری منزل پر پہنچے اور سب سے ایک ایک کر کے لپٹتا چلا جائے۔

وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ "چلو اُٹھو عابدہ" پھر وہ چونک پڑا اور جھک کر آہستہ سے کہا۔ "سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ آخر یہ کیا تماشا ہو رہا ہے؟"

"تماشا" عابدہ بیگم نے آنسو بھری آنکھوں سے اسے گھُورا۔

"ارے!" وہ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ "نزہت بیٹی تم بھی رو رہی ہو؟"

ایئرلائن کی ایک ہوسٹس نے قریب آکر بہت میٹھی اور ملائم انگریزی میں اُن سے پوچھا۔ "میں کوئی خدمت کر سکتی ہوں؟"

"شکریہ" جلال الدین گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جیسے اس نے طیارے میں اعلان کر دیا۔ "ہم مشرقی پاکستان سے آرہے ہیں۔ ہمارا نوجوان داماد وہیں کہیں چٹاگانگ میں رہ گیا ہے۔ وہ رشتے میں میری بیوی کا بھانجا بھی تھا۔ ہم پاکستان سے چل کر پاکستان آئے ہیں تو اب میری بیوی کو اپنا بھانجا یاد آرہا ہے۔"

"اوہ!" ایئر ہوسٹس نے اس ایک لفظ میں نہ جانے افسوس کا اظہار کیا یا تعجب کا۔

پھر وہ نزہت پر جھکی اور آنسو پونچھنے کے لئے اسے اپنا رومال پیش کرتے ہوئے بولی "مت روؤ پیاری لڑکی خدا کرے گا تمہیں تمہارا میاں مل جائے گا۔" پھر وہ چونک کر سیدھی کھڑی ہو گئی اور جلال الدین سے پوچھا "یہ آپ کی بیٹی ہے نا؟"

"جی" جلال الدین بولا "اس کی شادی چھ سات ماہ پہلے ہوئی تھی۔"

"اوہ!" اب کے ہوسٹس کے اس لفظ میں واضح طور پر دکھ تھا۔ پھر وہ نزہت کے سامنے جھکی اور بولی "میں وعدہ کرتی ہوں پیاری لڑکی کہ اگر ہماری ایئرلائن نے ڈھاکے کی سروس شروع کی تو میں وہاں جب بھی جاؤں گی تمہارے میاں کو تلاش کروں گی اور اسے تمہارے پاس کراچی پہنچا کر دم لوں گی۔ وعدہ رہا۔ لو ہاتھ ملاؤ۔"

نزہت آنسوؤں میں مسکرانے لگی۔ اس نے بڑے پیار سے ہوسٹس کو دیکھا، اس سے ہاتھ ملایا، پھر مشین کی سی تیزی سے پرس کھولا اور ایک کتاب میں سے ایک تصویر نکال کر ہوسٹس کو تھما دی۔

"اوہ، سویٹ!" ہوسٹس بولی۔

"اس کا نام اشرف ہے" جلال الدین بولا "اشرف رضا۔ جنگ کا ابھی کچھ ایسا زور نہیں تھا جب وہ ادھر چٹاگانگ کی طرف دو تین دن کے لئے گیا تھا پر دو تین ماہ تک واپس نہ آیا۔ ادھر ہمیں اپنی جان کی پڑی تھی۔ ہم ڈھاکے سے بھاگے اور یہاں پہنچنے میں ڈھائی مہینے اور لگ گئے۔ یوں سمجھئے کہ اشرف چھ ماہ سے لاپتہ ہے۔ لائیے میں اس تصویر کے پیچھے اس کا نام اور رہائش اور محلے کا پتہ وغیرہ لکھ دوں۔"

"کیوں؟" نزہت نے اشرف کی تصویر ہوسٹس کے ہاتھ سے اچک لی "یہ تو میری تصویر ہے۔ میں کیوں دوں کسی کو؟" پھر پرس کھول کر تصویر اُس میں رکھتے ہوئے بولی۔ "ایک تصویر امی کے پاس بھی تو ہے۔ وہ دے دیجئے نا۔"

تینوں مسکرائے۔ عابدہ بیگم نے اپنا پرس کھول کر اشرف کی تصویر نکال دی۔

جلال الدین نے اس کی پشت پر ساری تفصیل اور پھر پاکستان میں طاہر کا پتہ بھی لکھ دیا۔ ہوسٹس نے تصویر لیتے ہوئے اپنا وعدہ دُہرایا کہ وہ اشرف کو تلاش کر کے دم لے گی۔

یکایک جلال الدین نے دیکھا کہ طیّارہ بالکل خالی ہو چکا ہے اور ائیر لائن کی ایک اور ہوسٹس جو دروازے پر مُسافروں کو خدا حافظ کہہ رہی تھی، وہاں سے فارغ ہو کر ان کی طرف آ رہی ہے۔ آتے ہی وہ بولی۔ "معاف کیجئے گا ——"

مگر جلال الدین نے اسے جملہ پُورا نہ کرنے دیا۔ "ہم معافی چاہتے ہیں۔ دراصل —— " مگر اب کے پہلی ہوسٹس نے جلال الدین کی بات کاٹ دی اور کسی یورپی زبان میں ہوسٹس سے باتیں کرنے لگی۔ اس نے اشرف کی تصویر بھی دکھائی۔ اس دوران میں جلال الدین، عابدہ بیگم اور نزہت سیڑھی کا آدھا حصّہ طے کر چکے تھے۔ دونوں ہوسٹسیں لپک کر آئیں اور آخری زینے پر نہایت پیار سے انہیں خدا حافظ کہا۔

مگر جلال الدین اس آخری زینے پر رُک گیا۔ ذرا سے انتظار کے بعد عابدہ بیگم بولی۔

"چلئے نا۔ کیا سوچ رہے ہیں؟"

اور جلال الدین بولا۔ "میں سوچ رہا ہوں کہ میں نے پاکستان کی زمین پر قدم رکھا تو کہیں یہ مجھے کرنٹ نہ مار دے!" پھر وہ ہنسنے لگا۔ عابدہ بیگم اور نزہت کے ہاتھ پکڑ کر بسم اللہ پڑھی اور زمین پر پاؤں رکھ دیا۔

سب کے جسموں میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ خوف کی طرح کبھی کبھی مکمل تحفظ کا احساس بھی تو جسم میں کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔

ائیرپورٹ کی بالائی منزل استقبال کرنے والوں سے قریب قریب خالی ہو چکی تھی۔ مگر ہوا اتنی تیز چل رہی تھی کہ ان کے لباس پھڑپھڑا رہے تھے اور جلال الدین کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سارا شہر ان سے لپٹا پڑ رہا ہے۔ غیر ملکی ہوسٹسوں نے جس

ہمدردی اور انسانیت کا مظاہرہ کیا تھا، اس کے جواب میں جلال الدین کا وطن سے محبت کا جذبہ چاہتا تھا کہ کوئی پاکستانی اس کی طرف بھاگتا ہوا، اسے پکارتا ہوا بازو پھیلاتے ہوئے آئے اور کہے کہ اے میرے بچھڑے بھائی ادھر اس رستے سے آؤ جہاں میں نے تمہارے لئے اپنی آنکھیں بچھا رکھی ہیں۔ آؤ میں تمہیں اپنے سر پر بٹھا لوں، مگر —— جلال الدین نے سوچا —— یہ ہوائی اڈہ ہے جہاں سب لوگ بہت مصروف ہوتے ہیں۔ آخر کسی کو کیا پتہ کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آ رہا ہوں —— چنانچہ اہل شہر کی بجائے اس نے شہر کی ہوا سے یہ تسکین حاصل کر لی اور عابدہ بیگم اور نزہت سے کہنے لگا۔ "دیکھا، پاکستانی ہوا کیسے ہمارے کپڑوں میں گھس کر ہمارے گدگدی کر رہی ہے!" اس پر نزہت یوں گنگی جیسے کسی نے سچ مچ اس کی قمیص میں ہاتھ ڈال کر اس کی پسلیوں پر انگلیوں کی پوریں دوڑا دی ہیں۔

ہوائی اڈے پر قدم رکھنے سے لے کر ہوائی اڈے کی عمارت سے باہر آنے تک جو شخص بھی سامنے آیا، وہ اسے اپنا شناسا سا لگا۔ وہ حیران تھا کہ یہ لوگ اسے دیکھ کر رُک کیوں نہیں جاتے، چونک کیوں نہیں پڑتے، "ہیلو جلال الدین!" کا نعرہ لگا کر وہ اسے سینے سے بھینچ کیوں نہیں لیتے۔ "معاف کیجئے گا۔" اس نے مجسم مسکراہٹ بن کر لاؤنج میں ایک شخص کو روک لیا تھا۔ "آپ کا چہرہ جانا پہچانا سا لگتا ہے!"

"مگر ——" وہ شخص ہکلانے لگا۔ "مگر معاف کیجئے گا، میں نے آپ کو نہیں پہچانا۔"

"میں ——" جلال الدین مسکرائے جا رہا تھا۔ "میں جلال الدین ہوں۔ محمد جلال الدین۔ ڈھاکے سے آ رہا ہوں۔ میرے خیال میں وہیں ڈھاکے میں کہیں آپ سے مل چکا ہوں۔"

"مگر میں تو ڈھاکے کبھی گیا ہی نہیں۔" وہ شخص بولا۔ "آپ کو دھوکا ہوا ہے" اور اور وہ جلال الدین کو جیسے ویرانے میں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

"دیکھئے۔" عابدہ نے ہکا بکا کھڑے جلال الدین کے پاس آ کر کہا۔ "لوگوں کو

پہچاننا چھوڑیئے اور طاہر بھائی کے ہاں پہنچنے کا بندوبست کیجئے۔"

اور جلال الدین ہوائی اڈے کی عمارت سے یوں نکلا جیسے دوسری بار ڈھاکے سے نکل رہا ہے۔

اس نے جس بھی ٹیکسی ڈرائیور کو چلنے کو کہا، جواب ملا کہ میٹر خراب ہے۔ ایک بار اس کا جی چاہا وہ ان سے اپنے آپ کو متعارف کرادے۔ اسے یقین تھا کہ اس کے منہ سے "ہم ڈھاکے سے آرہے ہیں" کے الفاظ سن کر ٹیکسی ڈرائیور اسے لپٹا لیں گے مگر اب اسے کچھ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے جب وہ اپنا تعارف کرا رہا ہوگا تو دراصل بھیک مانگ رہا ہوگا۔

میٹر اس ڈرائیور کا بھی خراب ہی تھا جو چلنے پر رضامند ہوگیا تھا مگر ساتھ ہی اس نے پندرہ روپے طلب کرلئے تھے۔

"پندرہ روپے"، جلال الدین کو صدمہ پہنچا۔ "پندرہ روپے کیسے میاں؟"

"چلئے بیٹھ جائیے نا اباجی" نزہت آس پاس سے گزرنے والوں کی ٹٹولتی نگاہوں میں گھر کر بولی۔ "یہ جا تو رہا ہے۔ دوسروں نے تو صاف انکار کر دیا ہے۔"

"زیادتی ہے" جلال الدین نے ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

عابدہ بیگم اور نزہت کو پچھلی سیٹ پر بٹھا کر اور صندوقچے کو گاڑی کی چھت پر رکھ کر وہ ڈرائیور کے پہلو والی سیٹ پر آبیٹھا۔ "چلئے حضور" وہ بولا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ اس شہر میں پہلے کبھی نہیں آئے" ڈرائیور نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

"لو ارے بھائی میں تو درجنوں بار آیا ہوں" جلال الدین ہنسا۔ پھر مڑ کر عابدہ بیگم اور نزہت سے کہنے لگا "یہ بھائی ہمیں ہمارے میلے لباسوں سے گنوار سمجھ رہا ہے شاید" پھر وہ ڈرائیور کو مخاطب کرتے ہوئے بولا "ہم ڈھاکے سے آرہے ہیں بھائی۔"

"ڈھاکے سے؟" ڈرائیور یوں حیران رہ گیا جیسے ڈھاکہ مریخ کا کوئی شہر ہے۔ پھر اس نے کار کو سڑک کے کنارے لے جا کر روک لیا، سٹیئرنگ پر سے ہاتھ اٹھا کر انہیں جوڑا اور بڑی عاجزی سے بولا۔ "مجھے معاف کردیجئے بھائی صاحب۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ وہاں سے آرہے ہیں۔ وہاں سے آنے والوں کو تو ہمیں آنکھوں پر بٹھانا چاہیئے۔ خدا کے لئے مجھے معاف کردیجئے ورنہ میں کوئی ایکسیڈنٹ کر بیٹھوں گا۔"

خوشی کے مارے جلال الدین کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ اس نے ڈرائیور کے جڑے ہوئے ہاتھوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرانے لگا اور پھر ڈرائیور سے یوں لپٹ گیا جیسے ہوائی اڈے پر اترنے سے لے کر اب تک وہ اسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ پچھلی سیٹ پر عابدہ بیگم اور نزہت مسکرا بھی رہی تھیں اور رو بھی رہی تھیں۔ ڈرائیور نے آستین سے اپنے آنسو پونچھے، کار سٹارٹ کی اور جیسے اپنے آپ سے کہنے لگا "ہم بھی کیسے چھوٹے کیسے کمینے لوگ ہیں۔ جو بھی سواری ملتی ہے، اسے لوٹنے کی تاک میں رہتے ہیں۔ یہ سوچنے کی توفیق نہیں کہ یہ جو شخص ٹیکسی لینے آیا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس کا کوئی مرگیا ہو، یہ اپنے کسی پیارے کے جنازے میں پہنچنا چاہتا ہو، اس کا بچہ بیہوش پڑا ہو اور یہ ڈاکٹر سے دوا لینے جارہا ہو، ہم بھی کیسے بدنصیب لوگ ہیں جو اپنے بچوں کے پیٹ بھرنے کی خاطر دوسروں کے بچوں کے پیٹ کاٹ لیتے ہیں" ذرا دیر رک کر وہ جلال الدین سے مخاطب ہوا "آپ مجھے معاف نہ کردیتے تو پتہ ہے میں کیا کرتا۔ میں آپ کو پہنچا کر سیدھا ریلوے سٹیشن جاتا اور وہاں کسی گاڑی کے نیچے سر رکھ دیتا۔"

"توبہ کرو بھائی، کیسی باتیں کرتے ہو" جلال الدین نے بظاہر بڑی اداسی سے ڈرائیور کا کندھا تھپتھپایا مگر وہ اندر سے کتنا آسودہ تھا! پاکستان آخر اس سے متعارف ہو رہا تھا!

ڈرائیور اپنی دُھن میں بولتا ہی چلا گیا۔ "آپ لوگ ڈھاکے سے آ رہے ہیں جہاں قیامتیں گزر گئیں۔ پتہ نہیں آپ کہاں کہاں سے لٹ کر اپنے پاکستان پہنچے اور یہاں میں ——— ایک لٹیرا ——— آپ کی تاک میں بیٹھا تھا کہ آپ کی ہڈی پر اگر کوئی بوٹی رہ گئی ہو تو اسے بھی نوچ لوں۔ لعنت ہو مجھ پر۔"

"اب اور شرمندہ نہ کرو۔" جلال الدین شرمندہ ہونے کی بجائے باغ باغ ہو رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہم وطنی بھی کیسا عجیب رشتہ ہوتا ہے۔ ایک وہ ڈھاکے کے ہم وطن تھے، ایک یہ ٹیکسی ڈرائیور ہے!

مرزا طاہر بیگ کے گھر کے سامنے جب ٹیکسی رُکی اور ڈرائیور نے چھت پر سے صندوقچہ اتارا تو جلال الدین نے عابدہ بیگم اور نزہت کے لئے کار کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے پندرہ روپے ادا کرنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ڈرائیور نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "نہیں صاحب یہ نہیں ہوگا۔" وہ بولا "اگر آپ میرے سینے میں گھونپنے کے لئے جیب میں سے چاقو نکالنے لگے ہیں تو میں آپ کا ہاتھ چھوڑ دوں گا، لیکن اگر آپ کرایہ نکالنے چلے ہیں تو میں آپ کو یہ نہیں کرنے دوں گا۔ آپ نے مجھے معاف کر دیا تو میرا کرایہ مجھے مل گیا۔"

آس پاس سے لوگ یہ دیکھ کر جمع ہونے لگے کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور اور مُسافر کسی بات پر اُلجھ پڑے ہیں۔ اچھا خاصا ہجوم ہو گیا۔ تب طاہر بیگ گھر سے باہر آیا اور جلال الدین کو سینے سے بھینچ کر اُٹھا لیا۔ دونوں ہنس بھی رہے تھے اور رو بھی رہے تھے۔ پھر جلال الدین نے طاہر کا ہاتھ پکڑا اور اسے عابدہ بیگم اور نزہت کے پاس لے آیا۔ ابھی دو چار ہی باتیں ہوتی تھیں کہ جلال الدین وحشت زدہ ہو کر پلٹا۔ ڈرائیور موقع پا کر اچانک ٹیکسی بھگا لے گیا تھا۔ جلال الدین چند قدم اس کے پیچھے بھاگا۔ پھر رُک گیا اور جیسے سارے ہجوم کو مخاطب کر کے بولا۔ "وہ ایک اصلی پاکستانی جا رہا ہے ——— سچا اور کھرا!"

طاہر بیگ کے قریب آ کر اس نے سارا واقعہ سنایا۔ لوگوں نے یہ واقعہ یوں سانس روک کر سنا جیسے الف لیلہ کی کہانی سُن رہے ہیں۔

اچانک طاہر بیگ کو محسوس ہوا کہ مستورات بہت دیر سے محلے کے ہجوم میں گھری کھڑی ہیں۔ "یہ سب میرے محلے دار ہیں، سب میرے بھائی ہیں۔" وہ انہیں اندر لے جاتے ہوئے بولا، مگر پھر رُک گیا اور ہجوم سے مخاطب ہوا۔ "معاف کیجئے گا، یہ میرے بہت عزیز دوست جلال الدین ہیں۔ یہ مشرقی پاکستان سے لٹ پٹ کر آ رہے ہیں۔ ڈھائی تین مہینے پہلے ڈھاکے سے نکلے تھے اور اب جانے کہاں کہاں سے ہوتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔ جب آزادیاں ختم ہوتی ہیں تو راستے لمبے ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ ڈھاکے میں ایک بھرا پرا گھر چھوڑ کر اس صندوقچے کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔" طاہر بیگ نے جلال الدین کے ہاتھ سے صندوقچہ چھین کر اسے بلند کیا۔

ہجوم میں سے ایک بولا۔ "شاید انہی کے لئے آپ نے وہ والا فلیٹ کرائے پر لیا ہے؟"

"جی ہاں، انہی کے لئے۔" طاہر بیگ نے جواب دیا۔ "مجھے کھٹمنڈو سے اُن کا خط ملا تو میں نے فوراً ایک مکان کا بندوبست کر لیا۔ یہ سب کچھ میں نے اس لئے عرض کیا ہے کہ اب جلال الدین بھی یہیں رہیں گے۔ اگر وہ اس شہر میں رہیں گے تو پھر اسی کالونی میں رہیں گے۔ ہم انہیں اور کہیں نہیں جانے دیں گے۔ پھر میں نے یہ تعارف اس لئے بھی کرایا ہے کہ مشرقی پاکستان سے آنے والے ہمارے بھائی ہم سب کی محبتوں کے مستحق ہیں۔ یہ ایک بھٹی میں سے تپ کر کندن بن کر نکلنے والے پاکستانی ہیں۔"

ہجوم میں سے ایک بزرگ بولے۔ "اللہ انہیں برکت دے۔ خدا ہمیں ان کے زخم مندمل کرنے کی توفیق دے۔"

اس بات پر نزہت یکایک بچے کی طرح بلک کر رو دی اور جلال الدین اسے سنبھالنے کو لپکا۔ پھر اُداس ہجوم منتشر ہونے لگا اور طاہر بیگ تینوں کو اندر لے آیا۔

طاہر بیگ کی بیوی اور بیٹیاں عابدہ بیگم اور نزہت سے لپٹ لپٹ گئیں اور دیر تک رونے رُلانے کا دور چلا۔ پھر سب نے مل کر کھانا کھایا اور طاہر بیگ نے جلال الدین کو بتایا کہ اس وقت اس کے مکان میں مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے تین خاندان موجود ہیں ورنہ وہ جلال الدین کو اپنے گھر میں رکھتا اور کرائے پر مکان لینے کی ضرورت نہ پڑتی۔ "بہرحال" طاہر بیگ بولا "یہ فلیٹ یہیں قریب ہے۔ بس کوئی ایک پون فرلانگ کا فاصلہ ہوگا۔ دوسری منزل ہے، دو کمرے ہیں، کچن ہے، باتھ ہے۔ بجلی، پانی، گیس سب کچھ ہے۔ تم جب تک یہاں کوئی ملازمت یا کاروبار شروع نہیں کرتے، یوں سمجھو کہ یہ کرائے کا مکان میرا مکان ہے۔ یعنی تمہارا مکان ہے۔"

کھانے کے بعد طاہر بیگ نے ملازم سے صندوقچہ اٹھوایا اور تینوں کو ان کا نیا گھر دکھانے لے چلا۔ یہ تھا تو ایک معمولی سا فلیٹ مگر طاہر بیگ کی محبت نے اسے چمکا دیا تھا۔ تین نئے پلنگوں پر نئے بستر لگے تھے۔ غسل خانے میں تولیہ صابن تک موجود تھا۔ کچن میں تمام ضروری برتن سجے تھے اور سوئی گیس کا نیا چولھا جیسے نئے مالکوں کی خاطر بنا ٹھنا بیٹھا تھا۔ جلال الدین نے یہ سب کچھ دیکھا تو ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ تشکر کا کوئی لفظ کہنے لگا تو اس کا گلا رندھ گیا۔ طاہر بیگ نے اسے سینے سے لگا لیا۔ پھر سب کو آرام کرنے کو کہا اور تاکید کی کہ پانچ چھ بجے وہ اس کے ہاں آ کر چائے پئیں اور پھر رات کا کھانا کھائیں۔ "جب تک ملازم تمہارے گھر کے لئے ایک مہینے کا سودا سلف بھی لے آئے گا اور میرا سارا گھر کل کا کھانا تمہارے ہاں کھائے گا۔ کیوں نزہت بیٹی؟"

"جی بسم اللہ۔" نزہت خوش ہو کر بولی۔

طاہر بیگ کے جانے کے بعد تینوں اپنے اپنے پلنگوں پر جیسے بت بنے بیٹھے رہے۔ پھر جلال الدین نے اپنی آنکھیں پونچھیں اور پلنگ پر دراز ہو کر بولا۔ "ٹھیک ہے۔ حالات نے ہمیں لوٹ لیا مگر طاہر نے پورے پاکستان کی نمائندگی کر دی ہے۔ اس کے برتاؤ نے میرے تو سب زخم مندمل کر دیئے ہیں۔"

"سب زخم ابا جان؟" نزہت نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔ پھر آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک کر اس کے چہرے پر دوڑنے لگے "سب کے سب زخم مندمل ہو گئے آپ کے؟ کوئی ایک بھی نہیں بچا؟" رونے پر ضبط کرنے کی خاطر اس نے نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا لیا۔ اس نے پرس کھولا، اشرف کی تصویر نکالی اور جلال الدین کو دکھاتے ہوئے بولی "یہ زخم بھی ابا جان؟"

"نزہت بیٹی!" جلال الدین تڑپ کر اٹھا۔ عابدہ بیگم بھی نزہت کی طرف بڑھی۔ "اب اپنے آپ کو سنبھالو میری بچی۔" اس نے نزہت کو لپٹا لیا۔ پھر دونوں نزہت کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ وہ اس کے سر اور پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے رہے مگر زبان سے کچھ نہ بولے۔ وہ جانتے تھے کہ نزہت کے زخم کا اندمال مشکل ہے۔ خاصے وقفے کے بعد عابدہ بیگم کو گفتگو کا ایک موضوع سوجھا۔ وہ ان غیر ملکی ائیر ہوسٹسوں کی باتیں کرنے لگیں جو اشرف کی تصویر لے گئی تھیں اور جنہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ڈھاکے کی ہر فلائٹ پر اشرف کا سراغ لگانے کی کوشش کریں گی۔

"آپ تو میری والی تصویر بھی انہیں دینے لگی تھیں۔" نزہت نے طنزاً کہا۔ "اگر آپ دے ڈالتیں ——— اگر آپ مجھ سے یہ تصویر چھین لیتیں تو پتہ ہے کیا ہوتا؟ میرے لئے اشرف سچ مچ مر جاتا۔"

نزہت اب کے تو بالکل ٹوٹ کر رو دی۔ بہت دیر تک جلال الدین اور

عابدہ بیگم اسے بہلانے کی کوشش کرتے رہے اور اس کوشش میں خود بھی روتے رہے۔

پھر جب تینوں طاہر بیگ کے ہاں جانے کے لئے تیار ہوئے اور نزہت نے پرس اٹھالیا تو عابدہ بیگم نے اسے ٹوکا: "چار قدم پر تو جانا ہے بیٹی، اور تم پرس لئے آرہی ہو۔ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ پرس کو صندوقچے میں رکھ دو اور صندوقچے کا تالا اتارتی لاؤ۔ باہر کے دروازے میں لگائیں گے۔"

نزہت نے ایک پل سوچا۔ پھر بولی۔ "جی اچھا"۔ پلٹ کر پرس صندوقچے میں رکھا اور صندوقچے کا تالا کھول کر دروازے تک آئی۔ تالا لگاتے ہوئے اس کا ہاتھ رُک گیا۔ "امی"۔ وہ بولی۔ "پرس تو چلو نہیں لاتی۔ سچ مچ اچھا نہیں لگتا۔ پر آپ کہیں تو تصویر نکال لاؤں؟"

"تو تو بیٹی کچھ کچھ پاگل ہو رہی ہے میری طرح"۔ جلال الدین نے اسے پیار سے ڈانٹا۔ اس کے ہاتھ سے تالا لے کر دروازے میں لگایا، چابی جیب میں ڈالی اور تینوں طاہر بیگ کے مکان کی طرف چل پڑے۔

چائے اور پھر کھانے کی میز پر خوب مزے مزے کی باتیں ہوتیں رہیں۔ طاہر بیگ نے اپنی بیوی بیٹیوں کو سمجھا دیا تھا کہ ڈھاکے کا کوئی ذکر نہ آنے پائے۔ وہ اپنے شہر کی بھیڑ بھاڑ اور گہما گہمی کی باتیں کرتا رہا اور طاہر بیگ کی اس بات نے تو نزہت تک کو ہنسا دیا کہ جب پہلی بار اس شہر میں آنے والے ایک صاحب ریلوے سٹیشن سے نکلے اور شہر میں داخل ہوئے تو انسانوں اور ٹریفک کے انبوہِ کثیر کو دیکھ کر اپنے میزبان سے نہایت معصومیت کے ساتھ پوچھا۔ "کیوں صاحب یہ شہر خالی کیوں ہو رہا ہے؟"

ملازم شام ہی کو جلال الدین کے گھر کے لئے مہینے بھر کا سودا سلف خرید لایا

تھا۔ عابدہ بیگم اور نزہت کو وہیں چھوڑ کر طاہر بیگ نے جلال الدین اور ملازم کو ساتھ لیا اور سامان پہنچانے فلیٹ کی طرف چلا۔

فلیٹ میں روشنی ہو رہی تھی۔ جلال پہلے تو حیران ہوا، مگر پھر یہ توجیہہ کرلی کہ عورتیں گھروں کے معاملے میں بہت محتاط اور دور اندیش ہوتی ہیں اور عابدہ یا نزہت نے تالا لگانے سے پہلے بجلی جلا دی ہوگی، مگر جب سیڑھیاں چڑھ کر جلال الدین تالا کھولنے کے لئے جھکا تو ایک لمحے تک جھکا رہا اور پھر نیچے بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا جلال؟" طاہر بیگ نے گھبرا کر پوچھا۔

اور جلال الدین نے فرش پر سے تالے کے دو ٹکڑے چن کر ہتھیلی پر رکھے اور ہتھیلی کو بند کر دیا۔ طاہر بیگ دیوانوں کی طرح دروازہ کھول کر اندر لپکا۔ پلنگوں پر سے بستر غائب تھے۔ کچن میں برتن، چولہے سمیت غائب تھے۔ غسل خانے میں تولیے تک غائب تھا۔ طاہر بیگ اور جلال الدین جیسے سناٹے میں آکر ایک کمرے کے وسط میں گڑ سے گئے تھے۔ ملازم مہینے بھر کا سودا سلف ایک کونے میں رکھ کر واپس جا چکا تھا۔ پھر طاہر بیگ نے جلال الدین کا ہاتھ پکڑا، اسے محبت سے دبایا اور بولا۔ "تم کیوں اداس ہو جلال؟ چوری تو میری ہوئی ہے۔"

جلال الدین کے اندر تب تک دُکھ کا ایک طوفان جمع ہو چکا تھا۔ اس نے طاہر بیگ کو سینے سے لگا لیا اور زور زور سے رونے لگا۔ اور طاہر بیگ ابھی جلال الدین سے کچھ کہہ نہیں پایا تھا کہ دروازے پر نزہت نمودار ہوئی۔ وہ وہاں ذرا سا رکی اور پھر ایک پلنگ کی طرف لپکی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر وہ پلنگ کے نیچے رکھے ہوئے صندوقچے پر جھپٹی، اسے اپنی طرف گھسیٹا اور پھر اسے اس وحشت سے کھولا کہ ڈھکنا ٹوٹ کر الگ جا گرا۔

تب عابدہ اور طاہر بیگ کی بیوی اور بیٹیاں بھی ہانپتی ہوئی آنکلیں۔ سب

نزہت کی طرف بڑھیں جو صندوقچہ کھولنے کے بعد جیسے پتھر بن گئی تھی۔
کھلے صندوقچے میں میلے کپڑے جوں کے توں رکھے تھے۔ صرف نزہت کا پرس غائب تھا۔

نزہت، خشک ویران آنکھیں خلا میں گاڑے یوں بیٹھی تھی جیسے وہ ڈھاکے میں بیٹھی مکتی باہنی والوں کے قدموں کی چاپ سن رہی ہو۔

پھر جلال الدین نے "بیٹی، بیٹی" پکارتے ہوئے اسے دونوں کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور بولا "پرس میں کیا تھا بیٹی۔ تصویر تھی نا اشرف کی۔ پھر جب خدا کے فضل سے خود جیتا جاگتا اشرف ہمارے پاس سامنے آجائے گا تو ——"

"آپ کو پتہ نہیں ابا جی" نزہت بہت پراسرار انداز میں، جیسے راز کی کوئی بات بتاتی ہوئی بولی "ہم ابھی تک ڈھاکہ میں ہیں۔ اور اشرف سچ مچ مر گیا ہے اور مارنے والے اس کی لاش بھی اٹھا کر لے گئے ہیں"

۱۹۷۷ء

عالاں

آماں ابھی وہی بلو رہی تھیں کہ وہ مٹی کا پیالہ لئے آنکلی۔ یہ دیکھ کر کہ ابھی مکھن ہی نہیں نکالا گیا تو لسی کہاں سے ملے گی، وہ کشمکش و پیچ میں پڑ گئی کہ واپس چلی جائے یا وہیں کھڑی رہے۔

"بیٹھ جاؤ عالاں" آماں نے کہا۔ "ابھی دیتی ہوں —— کیسی ہو؟"

"جی اچھی ہوں" وہ وہیں بیٹھ گئی جہاں کھڑی تھی۔

کچھ دیر کے بعد آماں بولیں "اب میں مکھن نکالنے لگی ہوں۔ بُرا نہ ماننا۔ نیت بُری نہ بھی ہو تو نظر لگ جاتی ہے۔ ابھی پچھلے دِنوں نورُاں نے مجھے مکھن کا پیڑا نکالتے دیکھا تھا تو دوسرے دن مُرغی کے انڈے کے برابر مکھن نکلا، اور اس سے اگلے دن چڑیا کے انڈے کے برابر۔ گائے کو تین دن مرچوں کی دھونی دی تو نظر اُتری"

عالاں گنگنی "نظر تو کبھی کبھی میری بھی لگتی ہے بی بی جی۔ اس سے پہلے آپ کا شیشے کا ایک گلاس توڑ چکی ہُوں"

"ہاں ہاں" آماں کو یاد آگیا "تم نے کہا۔ ہائے بی بی جی۔ کیسا صاف شفاف ہے کہ نظر آر پار جاتی ہے اور پھر یوں ہی پڑے پڑے ٹھنّیں سے ٹوٹ گیا۔ میں تو حیران رہ گئی" پھر انہوں نے عالاں کو ڈانٹا مگر اس ڈانٹ میں غصہ نہیں تھا۔ "لو اب ادھر

پرلی طرف دیکھو۔"

اور وہ مسکراتی ہوئی ایک طرف کو گھوم گئی اور سامنے دیکھنے لگی۔ سامنے میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوپٹے کا پلو سر پر کھینچ کر ماتھے تک لے آئی اور بولی "بی بی جی، اندر چھوٹے میاں جی تو نہیں بیٹھے ؟"

"اری وہی عارف ہی تو ہے۔" اماں بولیں "رات آیا ہے۔"

عالاں اُٹھ کر دروازے تک آئی اور بولی "رد بلائیں، دُور بلائیں۔"

"کیسی ہو عالاں ؟" میں نے پوچھا۔

"جی اچھی ہوں۔" وہ بولی۔ پھر اس کے چہرے پر شرارت چمکی "پہلے تو میں آپ کو پہچانی ہی نہیں۔ میں سمجھی کوئی بچہ مونچھیں لگائے بیٹھا ہے۔"

اس پر اماں کو ہنسی چھوٹ گئی —— "توبہ ہے۔" وہ بولیں "کم بخت ایسی بات کرتی ہے کہ —— توبہ ہے!"

عالاں دہلیز پر یوں بیٹھ گئی کہ اس کا ایک پاؤں باہر صحن میں تھا اور ایک کمرے کے اندر نشست کے اس انداز نے اس کی نیلی تہمبند کو تان کر اس کی آدھی پنڈلیوں تک اُٹھا دیا تھا۔ اس کے میلے پاؤں کے مقابلے میں اس کی پنڈلیوں کا رنگ کتنا مختلف تھا! اور یہ پنڈلیاں کتنی سڈول تھیں! یونانیوں نے وینس کے بت کی جو پنڈلیاں بنائی تھیں، وہ کیا عالاں کی پنڈلیاں دیکھ کر بنائی تھیں!

"عارف میاں، پردیس میں آپ کیا کرتے ہیں ؟" اس نے مجھ سے یوں پوچھا جیسے چوپال میں بیٹھی گپ لڑا رہی ہے۔ ساتھ ہی وہ مٹی کے پیالے کو فرش پر ایک انگلی سے مسلسل گھمائے جا رہی تھی۔

میں نے کہا "نوکری کرتا ہوں۔ روپیہ کماتا ہوں۔"

"بی بی جی کو کتنا بھیجتے ہیں ؟" اس نے شرارت سے مسکرا کر پوچھا۔

"اے لڑکی!" اماں نے اسے ڈانٹا۔ "اپنی عمر کے لڑکوں سے یوں باتیں نہیں کرتے۔ اب تو چھوٹی نہیں ہے۔ کیا ابھی تک تجھے کسی نے نہیں بتایا کہ تو بڑی ہو گئی ہے۔"

وہ دہلیز پر بیٹھی بیٹھی اماں کی طرف گھوم گئی۔ اب اس کے دونوں پاؤں صحن میں تھے اور بالوں کا ایک ڈھیر کمرے میں تھا۔ "کون بتاتے بی بی جی ؟" وہ بولی "اماں ابا ہوتے تو بتاتے۔ انہیں تو خدا کے پاس جانے کی اتنی جلدی پڑی تھی کہ میرے سر پر سے اپنا ہاتھ اُٹھایا تو یہ انتظار بھی نہیں کیا کہ کوئی اس لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھے تو چلیں۔" عالاں کی آواز کو آنسوؤں نے بھگو دیا تھا۔

میں نے کہا "عالاں تمہاری ماں تو کب کی چل بسی۔ کیا باپ بھی چل دیا ؟"

اب کے گھوم کر اس نے دونوں پاؤں کمرے میں رکھ دیئے اور بولی "جی۔ وُہ بھی چلا گیا۔ میں لڑکا ہوتی تو شاید مجھے جوتا گانٹھنا سکھا جاتا پر وہ مجھ سے روٹیاں ہی پکواتا رہا اور پانی ہی بھرواتا رہا۔ اب میں ایک موچی کی بیٹی ہوں پر اپنے جوتے دوسروں سے مرمت کراتی ہوں۔"

"تو کیا ہُوا ؟" اماں بولیں۔ "تجھے صرف جوتے گانٹھنا نہیں آتے نا۔ باقی تو سب کام آتے ہیں۔ اپنی محنت سے کماتی اور کھاتی ہو۔ سارا گاؤں تمہاری تعریف کرتا ہے —— لو لسی لے لو۔"

عالاں جو اماں کی گفتگو کے دوران انہی کی طرف گھوم گئی تھی، اٹھی اور جا کر پیالہ اماں کے پاس رکھ دیا۔

وہ لسی کا پیالہ لے کر جانے لگی مگر چند قدموں کے بعد ایک دم رُک گئی اور پلٹ کر بولی "آج بھی چکی پیسنے آ جاؤں بی بی جی ؟"

"آ جانا، آ جانا۔" اماں بولیں "آٹا تو ڈھیروں پڑا ہے پر عارف کے ابا کی برسی بھی تو زیادہ دُور نہیں ہے۔ کئی بوریوں کی ضرورت پڑے گی۔ آ جانا۔"

"جی اچھا" وہ بولی۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے مجھ سے پوچھا "عارف میاں آپ کتنی چھٹی پر آئے ہیں؟"

میں نے کہا "میں ابا کی برسی کر کے جاؤں گا۔"

بولی "پھر تو بہت دن ہیں۔"

میں جب گاؤں میں اِدھر اُدھر گھوم کر واپس آیا تو وہ اندر ایک کوٹھریا میں بیٹھی چکی پیس رہی تھی۔ اوڑھنی اس کے سر سے اُتر گئی تھی اور کھلے بال چکی کے ہر چکر کے ساتھ اس کے چہرے کو چھپا اور کھول رہے تھے۔ اس نے ایک ٹانگ کو پورا پھیلا رکھا تھا اور نیلا تہبند اس کے گھٹنوں تک کھنچ گیا تھا۔ اگر ایسی پنڈلی کو کاٹ کر اور شیشے کے مرتبان میں رکھ کر ڈرائینگ رُوم میں سجا دیا جائے تو کیسا رہے!

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اماں کہیں نظر نہ آئیں تو میں پنجوں کے بل کوٹھریا کے دروازے تک گیا۔ دروازے سے آتی ہوئی روشنی ایک دم کم ہوئی تو اس نے چونک کر دیکھا۔ چکی روک لی۔ بالوں کو جھٹک کر سمیٹا اور اوڑھنی کو سر پر کھینچ لیا مگر پھیلی ہوئی ٹانگ کو پھیلا رہنے دیا۔ پھر وہ چکی کی ہتھی کو تھام کر اسے آہستہ آہستہ گھمانے لگی اور میری طرف دیکھتی چلی گئی۔

اس وقت میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ ایک موچی کی بیٹی کی آنکھوں کو اتنا بڑا نہیں ہونا چاہیئے۔ غریب غربا کو چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہی کفایت کر جاتی ہیں۔

اس کے چہرے پر شرارت تھی اور اس ڈر کے مارے کہ وہ کوئی فقرہ نہ مار دے، میں نے پوچھا "اماں کہاں ہیں؟"

وہ بولی "تو کیا آپ بی بی جی کو دیکھنے یہاں تک آئے تھے؟"

"تو کیا تمہیں دیکھنے آیا تھا؟" مجھے حملے کا موقع مل گیا۔

اس نے بس اتنا کیا کہ ٹانگ سمیٹی اور پھر پھیلا دی۔ پھر وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میں نے پھر پوچھا۔ "اماں کہاں ہیں؟"

"یہیں حویلی میں ہیں۔" اس نے کہا "آپ کے چچا کی بیٹی بیمار ہیں۔ انہیں دیکھنے گئی ہیں۔"

میں نے کہا "یہ جو تم پسائی کر رہی ہو، اس کی کتنی اُجرت لو گی؟"

"دو دن کا آٹا تو مل ہی جائے گا۔" اس کے لہجے میں کاٹ سی تھی۔ نہ جانے طنز کر رہی تھی یا اس کا لہجہ ہی ایسا تھا۔

"اچھا دو دن گزر گئے تو پھر کیا کرو گی؟"

"پھر آجاؤں گی آٹا پیسنے یا پانی بھرنے یا چھتیں لیپنے!"

"چھتیں لیپنے؟ کیا تمہیں چھتیں لیپنا بھی آتا ہے؟" میں نے سچ مچ حیرت سے پوچھا۔

اور وہ بولی "مجھے کیا نہیں آتا عارف میاں۔ بس ایک جوتے گانٹھنے نہیں آتے۔ اور بہت کچھ آتا ہے۔"

"مثلاً اور کیا کیا آتا ہے؟" میں نے شرارت سے پوچھا۔

"اور ——— ؟ اور ———" وہ کچھ بتلانے لگی تھی مگر جیسے سوچ میں پڑ گئی اور آخر بولی "سبھی کچھ آتا ہے آپ دیکھ لیں گے ہولے ہولے۔" چند لمحے وہ یوں چکی چلانے میں مصروف رہی جیسے مجھے بھول گئی ہے۔ پھر چکی روکی۔ اُٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ میں ایک طرف ہٹا تو وہ باہر آ گئی اور بولی "پیاس لگی ہے پر بی بی جی کا کٹورا جھوٹا ہو جائے گا۔ مجھے لپ میں پلا دیجئے۔"

"تم کٹورے ہی میں پی لو۔" میں نے کہا اور پھر ڈانٹ کے لہجے میں کہا "چلو، اٹھاؤ کٹورا۔ پیو پانی۔"

اس کی مسکراہٹ کتنی گلابی تھی۔ زندگی میں پہلی بار انکشاف ہوا کہ مسکراہٹ

کا بھی رنگ ہوتا ہے۔

وہ پانی پی چکی تو کٹورے کو کھنگالنے کے لئے اس میں ذرا سا پانی ڈالا۔ میں نے کہا "بھر دو کٹورا۔" وہ سمجھی شاید میں کٹورے کو پوری طرح پاک کرانا چاہتا ہوں۔ کٹورا بھر گیا تو اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے کٹورا اس کے ہاتھ سے اچک کر منہ سے لگا لیا۔ "عارف میاں جی!" وہ انتہائی حیرت اور صدمے سے بولی۔ وُہ حواس باختہ سی میری طرف دیکھتی رہی۔ اور جب میں نے خالی کٹورا واپس کیا تو اس کے ہاتھ میں رعشہ تھا اور اس کی آنکھوں میں نمی کی ایک چمکیلی تہ نمودار ہو گئی تھی اور اُس نے اوڑھنی کو یوں کس کے لپیٹ لیا تھا جیسے نماز پڑھنے چلی ہے۔

گاؤں میں جوان لڑکی کا ایک ایک قدم گنا جاتا ہے، ایک ایک نظر کا حساب رکھا جاتا ہے۔ بہت سے دوست بیٹھے تھے۔ لڑکیوں کا ذکر ہو رہا تھا۔ فلاں، فلاں کے ساتھ ہے۔ فلاں فلاں کے پیچھے ہے، فلاں اغوا ہونے کے انتظار میں ہے۔ فلاں اتنے ہاتھوں سے گزری ہے کہ اس بھری جوانی میں بھی پُرانی ہو گئی ہے۔

میں نے کہا "ایک لڑکی عالاں بھی تو ہے، نادرے موچی کی بیٹی؟"

اس پر سب ہنسنے لگے "وُہ؟" انہوں نے کہا "وہ کسی کام کی نہیں ہے۔ گھر گھر میں کام کرتی پھر رہی ہے۔ روپیہ کما رہی ہے۔ خوبصورت ہے پر نکمّی ہے۔ ایک بار بگو موچھیل نے چھیڑا تو بولی "میں موچی کی بیٹی ہوں۔ کھال اُتار لیتی ہوں!" بگو کو اتنی شرم آئی کہ سیدھا نائی کے پاس گیا اور مونچھوں کی نوکیں کٹوا دیں!" سب ہنسنے لگے اور دیر تک ہنستے رہے۔

میں نے کہا "اگر وہ اتنی محنتی لڑکی ہے تو اس کی عزّت کرنی چاہیئے۔"

ایک بولا "وہ عزّت بھی تو نہیں کرنے دیتی!"

اس پر سب کو ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑا۔

دوسرا بولا "تمہارے ہاں تو وہ بہت کام کاج کرتی ہے۔ کبھی اس کی عزّت کر کے دیکھو۔ کھال اُتار لے گی!"

وہ پھر ہنسنے لگے اور مجھے ان کی ہنسی میں شریک ہونا پڑا مگر مجھ سے اپنی ہنسی کی آواز پہچانی ہی نہیں گئی —— بالکل ٹین کے خالی کنستر میں کنکر بجنے کی آواز!

میں گھر واپس آیا تو وہ دروازے سے نکل رہی تھی۔ چہرہ بالکل تپا ہوا تھا۔ آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ میں چونکا اور پوچھا "کیا بات ہے عالاں؟ روتی رہی ہو؟"

وہ ہنسنے لگی۔ پھر ہنسی کے وقفوں میں بولی "روئیں میرے دُشمن۔ میں کیوں روؤں۔ میں تو مرچیں کوٹتی رہی ہوں عارف میاں!"

"تم مرچیں بھی کوٹ لیتی ہو؟" میں نے پوچھا "کوئی ایسا کام بھی ہے جو تمہیں کرنا نہ آتا ہو؟ تم اتنے بہت سے کام کیوں کرتی ہو عالاں؟"

وہ بولی "روپیہ کما رہی ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں روپے والے لوگ غریب لڑکیوں کو خرید لیتے ہیں۔ میرے پاس روپیہ ہوگا تو مجھ پر نظر اُٹھانے کی کسی کو مجال نہیں ہوگی۔ ہے کسی کی مجال؟" —— پھر وہ میرے قریب آکر سرگوشی میں بولی "میں نے آپ کے کرتے کے لئے ململ خریدی ہے۔ اس پر بیل بوٹے کاڑھ رہی ہوں۔"

"یہ غلط بات ہے۔" میں نے احتجاج کیا "تمہاری محنت کے کمائے ہوئے روپے سے خریدا ہوا کُرتا مجھے کاٹے گا۔"

"میں کسی کو بتاؤں گی تھوڑی۔" وہ بولی "آپ بھی نہ بتایئے گا۔ پھر نہیں کاٹے گا۔" وہ ٹھٹکی۔ پھر ایک دم گھبرا گئی۔ "ہائے میں مرجاؤں، کہیں بی بی جی تو نہیں سُن رہی ہیں۔"

"بی بی جی" کے لفظ پر میرے جسم میں بھی سنسنی دوڑ گئی۔ اندر جھانکا تو صحن خالی تھا۔ پھر پلٹ کر دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔

ٹھیک ہے۔ میں نے سوچا۔ اچھی لڑکی ہے۔ پیاری بھی ہے۔ شوخ بھی ہے۔ سب کچھ ہے مگر موچی کی لڑکی ہے اور خاندان کے بزرگ کہہ گئے ہیں کہ بلندی پر کھڑے ہو کر گہرے کھڈ میں نہیں جھانکنا چاہیئے۔ توازن بگڑ جاتا ہے اور آدمی گر جاتا ہے۔

ابا کی برسی کے روز ہمارے ہاں پورا گاؤں جمع تھا مگر اس ہجوم میں بھی عالاں کی دوڑ بھاگ نمایاں تھی۔ وہ پھرکی کی طرح گھومتی پھر رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اگر یہ لڑکی اس ہجوم سے نکل گئی تو برسی کی ساری تنظیم بگڑ جائے گی اور ہر طرف لٹس پڑ جائے گی۔ وہ بالکل برمے کی طرح، ہجوم میں سے راستہ بناتی ہوئی پار ہو جاتی اور پلٹ کر غڑاپ سے امی کے کمرے میں گھس کر کواڑ دھڑ سے بند کر دیتی۔ وہاں سے ہدایات لے کر وہ پھر باہر نکلتی اور پھر سے ہجوم میں برما لگا دیتی۔ عشاء کی اذان تک سارا گاؤں کھانا کھا چکا تھا۔ خالی دیگیں ایک طرف سمیٹ دی گئی تھیں۔ نائی، میراثی، دھوبی، موچی بھی فارغ کر دیئے گئے تھے۔ دن بھر کے ہنگامے کے بعد ایک بہت بھاری سناٹا گھر پر ٹوٹ پڑا تھا۔ آخری مہمان کو رخصت کر کے جب میں امی کے کمرے میں آیا تو مجھے یقین تھا کہ عالاں بیٹھی امی کے بازو اور پنڈلیاں دبا رہی ہو گی۔ مگر امی تو اکیلی بیٹھی تھیں۔ زندگی میں شاید پہلی بار امی کا لحاظ کئے بغیر میں ان سے پوچھ بیٹھا "عالاں کہاں ہے؟"

مگر امی اس سوال سے بالکل نہیں چونکیں۔ بولیں "وہ لڑکی ہیرا ہے بیٹا۔ بالکل ہیرا۔ آج تو وہ میری آنکھیں، میرے بازو، میرا سب کچھ تھی۔ دن بھر کی تھکی ماندی تو تھی ہی، کھانے بیٹھی تو دو چار نوالوں کے بعد جی بھر گیا۔ اُٹھ کر جانے لگی تو میں نے اسے روکا۔ اس دیگچی کو چاولوں سے بھرا اور اسے لے جانے کو کہا تو وہ بولی "یہ چاول تو مجھے عارف میاں دیتے ہوئے بھلے لگتے۔ اوروں کو رخصت کرتے رہے پر انہوں نے مجھے تو پوچھا ہی نہیں۔ میں نہیں لے جاتی۔" اس نے یہ بات ہنسی میں کہی پر اس نے

ٹھیک کہا بیٹا۔ اندر کا سارا کام اسی نے سنبھالے رکھا۔ تم سب کو رخصت کر رہے تھے، اسے بھی رخصت کرتے۔ ویسے تو وہ ہنستی ہنستی چلی گئی ہے پر اسے ہنسنے کی عادت ہے۔ اور بیٹا، جن لوگوں کو ہنسنے کی عادت ہوتی ہے نا۔ انہیں رونا بھی ہوتا ہے تو ہنسنے لگتے ہیں۔ تب وہ ہنستے ہیں تو اندر سے رو رہے ہوتے ہیں۔ تم نے ایک موچن سمجھ کر عالاں کی عزت نہ کی، حالانکہ عالاں کا اپنا مان ہے۔ اس کا یہ مان قائم رکھو بیٹا اور چاولوں کی یہ دیگچی اسے دے آؤ۔ تھوڑی دیر پہلے گئی ہے۔ سوئی نہیں ہو گی۔ پھر کل صبح صبح تم جا بھی رہے ہو۔ وہ کیا یاد کرے گی نہیں۔ جاؤ۔"

عالاں اپنے گھروندے کے دروازے کے پاس چارپائی پر لیٹی ہوتی تھی۔ میں نے پاس جا کر اسے آہستہ سے پکارا تو وہ تڑپ کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے اس کے قریب کوئی گولا پھٹا ہے۔

"عارف میاں جی!" وہ بولی۔ پھر حسبِ عادت ہنس کر کہا "چاول دینے آئے ہوں گے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ چاول ہی دینے آیا ہوں۔"

"لایئے۔" اس نے ہاتھ بڑھائے۔ "بی بی جی نے بتایا ہو گا، میں نے کیا کہا تھا۔" وہ ہنسنے لگی۔

"ہاں۔ بتایا ہے۔" میں نے کہا۔

دیگچی لے کر اس نے چارپائی پر رکھ دی اور بولی "وہاں گھر میں دیتے تو زیادہ اچھا لگتا۔ ویسے اب بھی اچھا لگ رہا ہے۔"

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ آخر ایک بات سوجھی۔ "میں کل صبح واپس جا رہا ہوں۔"

"وہ مجھے معلوم ہے۔" عالاں بولی۔

"معلوم تھا تو وہاں گھر میں ذرا سی رُک جاتیں"، میں نے کہا

وہ بولی "آپ کے کُرتے کا آخری ٹانکا باقی تھا۔ وہ آ کے لگایا ہے۔ جیسے میں اس کرتے کی جگہ تو ہوں گی نا؟ اور ہاں صبح آپ کا بکسا اُٹھا کر بسوں کے اڈّے پر مجھے ہی تو آپ کو پہنچانا ہے۔ بی بی جی نے کہا تھا۔"

میں نے کہا "تم کیا کچھ کر لیتی ہو عالاں۔ چکّی تم پیس لیتی ہو ——— چھتیں تم لیپ لیتی ہو۔ مرچیں تم کوٹ لیتی ہو۔ کنوئیں سے دو دو تین تین گھڑے تم پانی بھر لاتی ہو۔ پُورے گھر کا کام تم سنبھال لیتی ہو۔ کُرتے تم کاڑھ لیتی ہو۔ تم کس مٹّی کی بنی ہوئی ہو عالاں؟"

وہ خاموش کھڑی رہی۔ پھر دو قدم اُٹھا کر میرے اتنے قریب آ گئی کہ مجھے اپنی گردن پر اس کی سانسیں محسوس ہونے لگیں "میں تو اور بھی بہت کچھ کر سکتی ہوں عارف میاں" اس کی آواز میں جھنکار سی تھی "آپ کو کیا معلوم میں اور کیا کچھ کر سکتی ہوں"۔

ذرا سے وقفے کے بعد وہ بولی "مجھ سے پوچھئے نا، میں اور کیا کچھ کر سکتی ہوں"۔

پہلی جماعت کے بچّے کی طرح میں نے اس سے پوچھا "اور کیا کچھ کر سکتی ہو؟"

"میں پیار بھی کر سکتی ہوں عارف میاں"۔ اس نے جیسے کائنات کا راز فاش کر دیا۔

۱۹۷۷ء

نیلا پتھّر

امّاں نے ہمیں آدھی رات ہی کو جگا دیا "اٹھو بیٹو۔ منہ ہاتھ دھو لو۔ کپڑے بدل لو۔ شیرو مراثی اور نورا ساربان بس پہنچنے ہی والے ہوں گے"۔

اس وقت چاند سیدھا ہمارے سروں پر چمک رہا تھا۔ ہوا اتنی خاموشی سے چل رہی تھی کہ بیری کے صرف سائے میں کہیں کہیں جنبش ہوتی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اوپر پتّے ہل رہے ہیں۔ پنجرے میں سوتا ہوا طوطا اپنے سر کو ایک طرف کئے پَروں میں کچھ یوں چھپائے پڑا تھا جیسے کوئی اس کا سَر کاٹ لے گیا ہے۔ بلی روئی کا ایک گالا بنی بیٹھی تھی "مانو!" میں نے اسے بلایا تو وہ اٹھی۔ انگڑائی لی تو وہ اپنے قد سے ڈیوڑھی لمبی ہو گئی۔ پھر وہ وہیں سے کود کر میری چارپائی پر آ بیٹھی اور خُرخُر کرتی ہوئی میری گود میں گھسنے لگی۔

"تم نے بلّی کی عادتیں بگاڑ دی ہیں"۔ امّاں جو ہمارے لئے چُوری بنانے کی خاطر چولہا جلا رہی تھیں، بولیں "اب تمہارے جانے کے بعد یہ دو تین دن تک تو روتی پھرے گی"۔

بھائی جان نے پوچھا "اور امّاں۔ ہمارے چلے جانے کے بعد آپ تو نہیں روئیں گی نا؟"

"نہیں تو۔" اماں بولیں، اور پھر رونے لگیں۔

ہم چارپائیوں پر سے کود کر اماں سے لپٹ گئے اور اماں ہم دونوں کے سروں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے روتی رہیں اور کہتی رہیں "میں کیوں روؤں؟ میں زندگی بھر کیا کم روئی ہوں کہ اب بھی روؤں، جب میرے بچے میرا سہارا بننے والے ہیں۔ پھر جب تم دونوں نوکر ہو جاؤ گے نا تو میں اپنی گزری ہوئی زندگی سے جی بھر کر بدلے لوں گی۔ میں نواڑ کے پلنگ پر سوؤں گی۔ میں ریشم کی چادر اوڑھوں گی۔ میں طلّہ گچ جوتے پہنوں گی اور تمہاری بیویوں سے اپنے پاؤں دبواؤں گی۔"

"ہماری بیویاں آج کل کہاں رہتی ہیں اماں؟" میں نے پوچھا۔

اور بھائی جان ہنسنے لگے "پاگل ہے یہ چھوکرا۔ شرم نہیں آتی۔"

اماں بھی ہنسنے لگیں اور مجھے سینے سے بھینچ کر بولیں "وہ تمہارے چچا کی بالاخانے کی ممٹی پر ایک بڑا سا ستارہ چمک رہا ہے نا۔ اس میں رہتی ہیں۔ یہ ستارہ تھوڑا تھوڑا ہل رہا ہے۔ بتاؤ کیوں ہل رہا ہے؟"

میں بیری کے سائے کی ہلکی ہلکی جنبش دیکھ رہا تھا، فوراً بولا "ہوا سے ہل رہا ہے۔"

اور اماں ہنستی ہوئی بولیں "نہیں بیٹا۔ ہوا سے کہاں ہل رہا ہے۔ ستارہ اس لئے ہلتا ہوا معلوم ہو رہا ہے کہ تمہاری بیویاں تمہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہی ہیں اور تالیاں بجا بجا کر ہنس رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ اس بڑھیا کے ٹھاٹھ دیکھو۔ ہم سے پاؤں دبوائے گی! یہ منہ اور مسور کی دال!"

"یہ کہہ رہی ہیں؟" میں نے بگڑ کر کہا "میں انہیں ماروں گا۔"

اچانک بلّی چارپائی سے کود کر پھر سے میری گود میں گھس آئی۔ اماں نے اس کی گردن کا چمڑا چٹکی میں لے کر اُسے اٹھا لیا اور اسے ایک طرف ڈال کر پانی سے اپنا پوٹا دھوتے ہوئے بولیں "اس بے زبان کو تو پتہ چل گیا ہے کہ اطہر گرمیوں کی چھٹیاں

گزار کر واپس کیمبل پور جا رہا ہے۔"

ہم نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے۔ چُوری کھائی اور نورے کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تو اماں کے کہنے پر اسے بلانے نکلے۔

گاؤں بالکل چپ تھا جیسے سانس روکے پڑا ہے۔ جیسے کتے تک مر گئے تھے۔

"بھائی جان!" مجھ پر سناٹے کا ہول مسلّط ہونے لگا۔ "چلئے واپس چلیں۔ خود اماں کہتی ہیں کہ آدھی رات کے بعد گلیوں میں جنّ گھومتے ہیں۔"

بھائی جان بولے "اماں یہ بھی تو کہتی ہیں کہ آیۃ الکرسی پڑھنے سے جنّ بھاگ جاتے ہیں۔ آیۃ الکرسی پڑھو۔"

میں نے سوچا اگر ایسی بات ہے تو خود بھائی جان آیۃ الکرسی پڑھتے ہوئے آگے کیوں نہیں بڑھتے جبکہ نورے کا گھر کُل دو گلیاں دُور ہے۔ مگر میرے پاس زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں آیۃ الکرسی پڑھنے لگا۔

ابھی میں "وَلَا نوم" تک ہی پہنچا تھا کہ گلی کے پرلے سرے پہ ایک جن نمودار ہوا۔ "بھائی جان!" میں نے چیخنے کی حد تک سرگوشی کی اور بھائی جان سے لپٹ گیا۔

"آیۃ الکرسی پڑھو۔" انہوں نے بھی چیخ کی حد تک سرگوشی کی اور اپنے آپ کو میری گرفت سے آزاد کیا۔ "اماں کہتی ہیں کہ جن سے ڈر کر بھاگنے سے آدمی مر جاتا ہے۔ پھر جن ان بچّوں کو تو کچھ نہیں کہتے جو آیۃ الکرسی پڑھتے ہیں۔"

گلی کے پتھر لڑھک اور بج رہے تھے اور اب جن ہم سے کوئی دس گز دُور رہ گیا تھا۔ پھر وہ وہیں رُک گیا اور بولا "کون ہو تم؟ جن ہو؟ بھوت ہو؟ کون؟ بولو ورنہ پتّھر مارتا ہوں۔" اور اس نے جھک کر ایک پتّھر اٹھا بھی لیا۔

بھائی جان فوراً بولے مگر عجیب طرح بولے۔ میں ان کی آواز پہچان ہی نہ سکا۔ "ہم اکبر اور اطہر ہیں۔"

"اوئے بیڑا تر جائے تمہارا!" وہ پتھر زمین پر پھینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولا "میں تو ڈر گیا تھا تم تو میرے سائیں ہو۔ میرا تو دل میرے چار طرف دھڑکنے لگا تھا۔ میں بھی کہوں یہ کون ہاتھ ہاتھ بھر کی چیزیں کھڑی ہیں ——" اور پھر وہ ہنسا۔

"تم کون ہو؟" اب کے بھائی جان باقاعدہ کڑکے۔

وہ بولا "میں تمہارا دھوبی ہوں۔ زمان دھوبی۔ کیا کر رہے ہو یہاں آدھی رات کو؟"

میں پہلی بار بولا "ہماری چھٹیاں ختم ہو گئی ہیں۔ ہم کیمبل پور جا رہے ہیں۔ ہم شیرو میراثی اور نورے ساربان کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"تم اس وقت کیا کرتے پھرتے ہو؟" بھائی جان نے زمان سے یہ سوال ایسے رُعب سے پوچھا جیسے اُستاد بچوں سے پوچھتے ہیں۔

زمان بولا "میں پتھر کاٹنے جا رہا ہوں۔ روز اس وقت گھر سے نکلتا ہوں۔ صبح کی نماز نیلی ڈھیری پر پڑھتا ہوں۔ پھر وہاں نیلا پتھر کاٹتا ہوں۔ تمہارے چچا نیا مکان بنوا تیں گے نا نیلے پتھر کا۔"

"کیا دھوبی بھی پتھر کاٹتے ہیں؟" بھائی جان نے حیران ہو کر پوچھا۔

اور زمان نے جواب دیا "جب دھوبی کے پاس دھونے کو کچھ نہ ہو تو اسے پتھر ہی کاٹنے چاہئیں۔ ورنہ وہ انسانوں کو کاٹنے لگے گا۔" وہ ذرا سا رُکا مگر ہمیں خاموش پاکر ہنس دیا۔ پھر بولا "کیا کروں۔ چھ بچے ہیں۔ نہ ان کی ماں ہے نہ دادی۔ سب مجھ میں گھسے چلے آتے ہیں بلی کے بچوں کی طرح۔ سب کا دوزخ بھرنا ہوتا ہے اور خدا میرا سہارا ہے اور میں اُن کا سہارا ہوں۔"

سہارا! مَیں نے سوچا۔ یہ سہارا کیا ہوتا ہے؟ ابھی ابھی اماں بھی کہہ رہی تھیں کہ تم میرا سہارا ہو۔ اب یہ زمان دھوبی بھی کہہ رہا ہے کہ خدا اس کا سہارا ہے اور وہ اپنے بال بچوں کا سہارا ہے۔ آخر کیا ہوتا ہے یہ سہارا —— "کیوں بھائی جان، یہ سہارا کیا ہوتا ہے؟"

مگر بھائی جان نے تو میری بات سنی ہی نہیں۔ تالی بجا دی "آ گیا نورا!" انہوں نے نعرہ مارا۔

"اب نیلی ڈھیری پر مُلاقات ہو گی۔" زمان دھوبی بولا "خوشاب کا راستہ وہیں سے گزرتا ہے نا۔ میں تمہیں ایک نیلا پتھر دوں گا جو مَیں نے چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس میں گہری نیلی لہریں ہیں اور نیلی نیلی چڑیاں سی اڑ رہی ہیں اور نیلے نیلے پھول سے کھل رہے ہیں۔ قدرت بھی عجیب عجیب کھیل کھیلتی ہے۔ میں تو دوپہر کو بھی وہ پتھر دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ نماز پڑھنے لگوں۔ لے جانا اپنے ساتھ۔ اپنے چاچا چاچی کو دینا۔ کہنا زمان دھوبی نے بھیجا ہے۔ وہ خوش ہوں گے۔ خُدا کے بعد ہم غریبوں کا وہی تو سہارا ہیں۔"

"سہارا!" میں باقاعدہ چونک پڑا۔ مگر زمان آگے بڑھ گیا تھا۔

دُور سے اونٹ کتنا بہت سا لمبا لگ رہا تھا۔ اس کی گردن میں لٹکی ہوئی گھنٹی یوں بج رہی تھی جیسے کوئی لڑکی گا رہی ہے۔ تب ایک مُرغ نے بانگ دے ڈالی۔ پھر تو بانگوں کا تانتا بندھ گیا۔ قادرے کے باڑے میں ایک بکری ممیائی اور فوراً بعد اس کا کتا بھونکا۔ گاؤں نے انگڑائی سی لی جیسے ہمیں رخصت کرنے کے لئے اُٹھ بیٹھا ہے۔ میں اندر بھاگا۔ پھر شیرو دروازے پر سے پکارا۔ "بی بی جی، پردہ۔ میں اندر آ کر بچوں کا صندوق اٹھا لوں۔"

"دو صندوق ہیں۔" میں نے شیرو کو ڈانٹا۔

"اہا ہا!" شیرو نے میری بغلوں میں ہاتھ رکھ کر مجھے پکڑا اور اپنے سر سے بھی اونچا لے گیا۔ "اب تو میرا چھوٹا سائیں بھی صندوق والا ہو گیا۔ تمہاری مونچھیں کب نکلیں گی۔ جلدی جلدی سے بڑے ہو جاؤ نا۔ پھر میں تمہاری شادی پر ایسا ایسا ڈھول بجاؤں گا کہ تان سین نے بھی ایسا ڈھول نہ بجایا ہو گا۔ تبھی تو مجھ غریب کا سہارا ہو۔"

پھر وہی سہارا! یہ سہارے کیا ہوتے ہیں آخر؟ میں اس سے پوچھنے لگا تھا کہ اس نے صندوق اُٹھا کر کندھے پر رکھا اور باہر چلا گیا۔ اندر کوٹھے میں امّی ہمیں لپٹاتے کھڑی رہیں اور کچھ پڑھتی رہیں اور ہم پر چھوہ چھوہ کرتی رہیں اور روتی رہیں۔ پھر شیرو دوسرا صندوق بھی لے گیا اور جاتے ہوئے کہہ گیا "چلو جی۔"

جب ہم کجاوے میں بیٹھے تو جب بھی ڈیوڑھی کے دروازے کے پیچھے سے امّی کی روتی روتی آواز آ رہی تھی "اللہ انہیں خیر خیریت سے پہنچانا۔ اللہ انہیں کوئی گزند نہ پہنچے۔ اللہ تیرے بعد یہی تو میرے سہارے ہیں۔"

سہارے! —— میں بھائی جان سے ضرور پوچھتا مگر ہم دونوں کے درمیان اُونٹ کا کوہان حائل تھا، اور پھر مجھے ایک دم بہت سا رونا بھی تو آ گیا تھا۔ اونٹ گلی کا موڑ مڑا تو میں ضبط نہ کر سکا۔ میں نے چیخ ماری "امّی جی!" —— اور بھائی جان کجاوے میں گھٹنوں کے بل اُٹھے اور مجھے ڈانٹا "دیکھتے نہیں ہو ساتھ شیرو اور نورا آ رہے ہیں۔ وہ کیا کہیں گے کہ ہم اتنے بزدل ہیں۔ پونچھ لو آنکھیں۔ چپ ہو جاؤ۔ آیت الکرسی پڑھو۔"

مجھے بھائی جان کی آواز بھی بھیگی بھیگی لگی۔ میں نے کہا "آپ بھی آنکھیں پونچھ لیں اور آیۃ الکرسی پڑھیں۔"

اور وہ جیسے مان گئے "اچھا!"

پھر میں نے کجاوے میں گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر کہا "بھائی جان۔ جب زمان دھوبی اپنے بچّوں کو گھر میں چھوڑ کر نیلی ڈھیری پر جاتا ہوگا تو ہماری طرح روتا ہوگا۔"

"کیوں؟ وہ کیوں روتے؟" بھائی جان نے پوچھا۔

میں نے کہا "ہم اپنی امّی کے سہارے ہیں۔ وہ اپنے بچّوں کا سہارا ہے۔ ہم رو رہے ہیں تو وہ کیوں نہیں روتا؟" میں سہارے کو فقرے میں استعمال کر کے بہت خوش ہو رہا تھا۔

"چپ رہو۔" بھائی جان بولے۔ "یہ تم آیۃ الکرسی پڑھ رہے ہو؟"

گاؤں سے باہر جب اُونٹ کھیتوں کی ایک پگڈنڈی پہ چلنے لگا تو نورے نے اسے روک لیا۔ پھر شیرو نے کجاوے کے قریب آ کر کہا "لو جی اب میں واپس چلوں۔ بچّے جاگیں تو مجھے کھاٹ پر نہ پا کر روئیں گے۔"

"تم اپنے بچّوں کے سہارے ہو نا چاچا شیرو؟" میں نے سہارے کا ایک اور فقرہ گھڑا، اور شیرو نے نورے سے کہا "دیکھا نورے۔ کیسی چٹاک پٹاک باتیں کرنے لگا ہے میرا چھوٹا سائیں۔" پھر اس نے اپنا ہاتھ اُوپر کجاوے کی طرف بڑھایا۔ میں نے کجاوے میں سے اپنا ہاتھ لٹکا کر مصافحہ کیا تو وہ میرے ہاتھ کو ہولے ہولے ہلا ہلا کر کہنے لگا "وعدہ کرو جی کہ اس ایک سال میں تم ایک دم دس سال بڑے ہو جاؤ گے۔ کہیں میں تمہاری جوانی کی راہ تکتے تکتے کھسک ہی نہ جاؤں اور کہیں یہ حسرت دل ہی میں نہ لے جاؤں کہ میاں اکبر اور میاں اطہر کی شادی پر میں دو سو روپے کماؤں گا اور اپنی ماں کے دانت لگواؤں گا۔ لکھ لو کسی کتاب میں۔ دو سو سے کم ایک پیسہ نہیں لوں گا۔ تم کم دو گے تو روٹھ جاؤں گا۔ میری ماں بیچاری تو اسی سہارے اپنے پوپلے منہ سے پٹاخے چھوڑتی رہتی ہے۔"

شیرو اور نورا ہنسے۔ پھر شیرو نے دوسرے کجاوے میں بھائی جان سے ہاتھ ملایا۔ اس نے بھائی جان سے بھی کچھ ایسی باتیں کی ہوں گی مگر میں نے سنی نہیں۔ اب اونٹ چلنے لگا تھا اور میں اونٹ کی گھنٹی کی ایک ہی رٹ سن رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی —— سہارے ہی سہارے۔ سہارے ہی سہارے۔ سہارے ہی سہارے۔

پھر یکایک یوں ہوا جیسے کسی نے چار طرف آسمان کے کنارے کے ساتھ چوربتی گھما دی ہے۔ آس پاس کی جھاڑیوں پر کہیں سے اتنی بہت سی چڑیاں آ گئیں کہ اونٹ کی گھنٹی کی رٹ دب گئی۔

”یہ تو آپس میں لڑ رہی ہیں۔“ میں نے بھائی جان سے کہا۔

اور اونٹ کی مہار تھام کر ہمارے آگے آگے چلتا ہوا نورا ہنس کر بولا ”نہیں میاں۔ لڑ کہاں رہی ہیں۔ دن بھر چیں چیں کرتی ہے۔ اس لئے گلے صاف کر رہی ہیں۔“

اس پر بھائی جان یوں ہنسے جیسے پکے فرش پر بلور کے بہت سے لعل گر پڑیں۔

پھر وہ بولے۔ ”چاچا نورے۔“

نورا پلٹے بغیر بولا۔ ”جی میاں۔“

بھائی جان نے کہا۔ ”کوئی کہانی سنا۔ جیسے پچھلے سال سنائی تھی۔“

نُورے نے پوچھا ”وہی گیدڑ والی جو تتے توے پر بیٹھ گیا تھا اور جب گھبرا کر بھاگا تھا تو اس کے ساتھ توا بھی چپٹا چلا گیا تھا؟“

ہم دونوں نے جیسے پُوری کہانی سُن لی! ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔

”چلو وہی سناؤ۔“ میں نے کہا۔ ”بھائی جان کو یاد ہو گی۔ مجھے تو یاد نہیں۔“

”مجھے تو یاد ہے۔“ بھائی جان بولے۔ ”پر مزیدار ہے۔ پھر سُن لیں گے۔“

”تو تو سنو،“ نورا بولا۔ ”ایک تھا گیدڑ۔ چور اچکا قسم کا گیدڑ۔ ایک غریب بڑھیا کے توے پر سے روٹیاں اُٹھا کر بھاگ جاتا تھا۔ ایک دن ــــــ“

اچانک بھائی جان بولے: ”ہم نیلی ڈھیری پر کس وقت پہنچیں گے چاچا نورے؟“

”نیلی ڈھیری پر،“ نورے نے جیسے سوچا۔ ”جب سُورج پُورا طباق سا نکل آئے گا نا، اس وقت ہم نیلی ڈھیری پر ہوں گے۔“

”اس وقت تک زمان دھوبی کتنا نیلا پتّھر کاٹ چکا ہو گا؟“ میں نے پوچھا۔

”ارے!“ نورے نے چلتے چلتے پہلی بار پلٹ کر دیکھا۔ ”میاں تمہیں کس نے بتایا کہ زمان پتّھر کاٹتا ہے۔“

بھائی جان بولے۔ ”ہم تمہاری راہ دیکھ رہے تھے تو گلی میں سے گزرا تھا۔ کہتا تھا میں تمہیں نیلی ڈھیری پر ملوں گا۔“

”اچھا!“ نورا مطمئن ہو گیا۔ پھر بولا ”یہ لوگ جاتے ہی تو پتّھر نہیں کاٹنے لگتے۔ اگر کل کا پتّھر رکھا ہو گا تو اسے کاٹیں گے۔ ورنہ صبح سویرے بارود بھریں گے۔ پھر بارُود کو فلیتہ لگائیں گے۔ زور کا ایک گولہ چھوٹے گا۔ چٹانیں خربوزوں کی طرح پھاڑی پھاڑی ہو جائیں گی۔ تب زمان اور دوسرے مزدور ان کو جمع کر کے انہیں ہاتھ ہاتھ بھر کے پتّھروں میں کاٹیں گے۔“

”ارے، اتنی محنت کرنی پڑتی ہے!“ بھائی جان بولے۔

”ہاں جی۔“ نورے نے تائید کی ”خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ ہڈیوں کے اندر کا گودا خشک کرنا پڑتا ہے۔ تب جا کر بال بچّوں کے لئے ایک روٹی کمائی جاتی ہے۔“

بھائی جان کو صدمہ سا پہنچا۔ بولے۔ ”تو پھر ہمارے چچا جان اینٹوں کا مکان کیوں نہیں بنوا لیتے؟“

”ارے نہیں میاں۔“ نورا ہنسا۔ ”نیلے پتّھر کے مکان کی تو شان ہی اور ہے۔ اکبر بادشاہ نیلے پتّھر ہی کے محل میں رہتا تھا۔ نیلے پتّھر کو بس لوہا سمجھو۔ مستری جب انہیں سنوارتے اور برابر کرتے ہیں تو ایک ایک پتّھر ایک ایک دن لیتا ہے۔“

”اچھا!“ ــــــ ”ہاں جی۔“

سُورج کا ماتھا مشرق میں چمکا تو نیلی ڈھیری کی طرف ایک دم بڑے زور کا دھماکہ ہوا اور آس پاس کی پہاڑیاں دیر تک بجتی رہیں۔ ”یہ لو میاں۔“ نورا بولا۔ ”بارود سے چٹان پھاڑ دی۔ اب جب ہم نیلی ڈھیری پر پہنچیں گے تو زمان اور دوسرے لوگ پتّھر کاٹ رہے ہونگے۔“

ہم نیلی ڈھیری پر پہنچے تو دو آدمی بھاگتے ہوئے ہمارے پاس سے گزرے۔ نورے نے انہیں ٹوکا۔ ”کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟“

"خیر کہاں بھائی۔" ان میں سے ایک بولا "کسی سے غلطی ہو گئی۔ ابھی لوگ ٹھیک طرح سے چھپنے بھی نہ پائے تھے کہ دھماکہ ہو گیا اور چٹان کے ٹکڑوں نے مزدوروں کو ادھیڑ کر پھینک دیا۔ کتنے ہی لوگ لہولہان ہو رہے ہیں۔ ہم گاؤں سے آدمی لینے جا رہے ہیں انہیں اٹھوا کر قصبے کے ہسپتال میں پہنچانے کے لئے۔"

"زمان تو ٹھیک ہے نا؟" میں کجاوے میں گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر پکارا۔

"زمان؟" اس شخص نے پوچھا۔

"ہاں ہاں بھئی۔ اپنا زمان دھوبی۔" نورا بولا۔

"اچھا ہاں۔ وہ دھوبی!" وہ شخص بولا "نیلے پتھر کی کرچوں سے اس بے چارے کی تو آنکھوں کی پتلیاں ہی ٹوٹ گئی ہیں۔ کانچ کی سی تو ہوتی ہے آدمی کی آنکھ۔"

بھائی جان جیسے فریاد کرتے ہوئے بولے۔ "مگر زمان تو کہتا تھا، خدا اس کا سہارا ہے اور وہ اپنے بچوں کا سہارا ہے!"

وہ شخص جلدی میں تھا۔ جاتے ہوئے بولا "اس بے چارے نے تو بس ایک ہی رٹ لگا رکھی ہے۔ میرے بچوں کا کیا بنے گا۔ میرے بچوں کا کیا بنے گا!"

کیا بنے گا؟ کیا بنے گا؟ کیا بنے گا؟ ——— اونٹ کی گردن میں بجتی ہوئی گھنٹی کے اس سوال نے پوری نیلی ڈھیری کو اپنے محاصرے میں لے لیا تھا اور آس پاس کی ڈھیریاں اس گونج کی جھولیاں بھر کر جیسے اُوپر آسمان کی طرف اچھال رہی تھیں۔

۱۹۷۶ء

بارٹر

رخشی نے سگریٹ کا کش لگا کر سر پیچھے پھینکا اور دھوئیں کو ایک مینار کی صورت میں چھت کی طرف اڑاتے ہوئے بولی: "ایک بات کہوں مودی؟ پر ایک شرط ہے۔ تم خفا نہیں ہو گے۔"

محمود کا یہ پانچواں پیگ تھا۔ پانچویں پیگ کے ساتھ ہی وہ بظاہر اپنے وجود میں سے نکل بھاگتا تھا اور اس کا ثبوت یوں دیتا تھا کہ گفتگو کے دوران میں ایک آدھ جملہ ترنّم میں ادا کرتا تھا۔ وہ بولا: "بول رخشی ڈارلنگ!" پھر وہ گنگنایا "بول کیا بولتی ہے؟"

رخشی نے ایک اور کش لگایا اور دھوئیں کو دھارے کی صُورت میں سیدھا محمُود کے کھُلے منہ میں چھوڑ دیا۔ محمود زور سے ہنسا اور بولا: "دیکھو ڈارلنگ، کہیں تمہارا سگریٹ بُجھ تو نہیں گیا ہے۔ اس کا دھواں تو بہت ٹھنڈا ہے، جیسے تمہارے گرم گرم پھیپھڑوں کے بجائے کلب کے ایئر کنڈیشنز میں سے نکلا ہے۔"

رخشی ہنسی اور کلب میں بیٹھے ہوئے سب خواتین وحضرات نے ایک ساتھ پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

دراصل رخشی بہت کم ہنستی تھی مگر جب وہ ہنستی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بہت سی کوئلیں ایک ساتھ بولنے لگی ہیں۔ عورتیں اس کی ہنسی کی نقل کرتی

تھیں۔ مرد جب سرور میں آتے تھے تو اس سے ذرا سا ہنسنے کی یوں فرمائش کرتے تھے جیسے وہ ہنستی نہیں ہے، غزل گاتی ہے۔ رخشی کو اپنی ہنسی کی قیمت کا احساس تھا۔ چنانچہ وہ اسے بہت کم خرچ کرتی تھی۔ وہ ہنسنے کے معاملے میں بہت تدبر سے کام لیتی تھی۔ جب ساری محفل قہقہے لگا رہی ہوتی تھی تو وہ صرف مسکرانے پر اکتفا کرتی تھی۔ وہ اپنی ہنسی کو اس ہجوم میں گنوانا نہیں چاہتی تھی، اس لئے جب وہ ہنستی تھی تو صرف وہی ہنستی تھی۔

رخشی کی ہنسی نے جیسے جال پھینک کر پورے کلب کی مچھلیاں سمیٹ لیں۔

"بھئی حد ہے!" رخشی کی ہنسی پر نگینہ تک چونک پڑی۔ نگینہ اور اس کا شوہر مختار آج پام گرو کلب میں اپنے دوستوں کے مہمان تھے اور نگینہ ان میں گھری ہوئی کہہ رہی تھی: "اگر میری ہنسی اتنی سُریلی ہوتی تو پتہ ہے میں کیا کرتی؟ میں ہنستے ہنستے مر جاتی۔"

اس پر مختار کے دوستوں نے نگینہ کو بڑی تشویش سے دیکھا اور مختار بولا۔

"تم اگر ہنستے ہنستے مر جاتیں، تو پتہ ہے میں کیا کرتا؟ میں روتے روتے مر جاتا۔"

"تو کیا آج کل تم اپنے آپ کو زندوں میں شمار کرتے ہو؟" نگینہ نے پوچھا اور سب مردوں نے ہنستے ہنستے میز پر ہاتھ، بلکہ سر دے مارے۔

"یہ لوگ کیوں ہنس رہے ہیں؟" رخشی نے محمود سے پوچھا۔

محمود بولا: "اس وقت نگینہ کے گرد مختار سمیت چار پانچ مرد جمع ہیں اور جب ایک خوبصورت عورت کے پاس اس کے شوہر کے علاوہ ایک سے زیادہ مرد جمع ہوں تو وہ ایک دوسرے کے ڈر کے مارے ——" اور اب محمود گنگنانے لگا —— "ایک دوسرے کے ڈر کے مارے باتیں کم کرتے ہیں اور ہنستے زیادہ ہیں۔"

رخشی اس بات پر تالی بجا کر اتنی ہنسی کہ وہ دوہری ہو گئی۔

اور سارا کلب حیران رہ گیا کہ رخشی نے دو ہی منٹ بعد دوبارہ ہنسنے کی عیاشی کیسے کر لی۔

مگر رخشی آج اسراف پر مجبور تھی۔ اسے آج محمود سے ایک کام تھا۔ "تو پھر کہوں مودی؟" اس نے پوچھا۔

محمود نے ترنّم میں جواب دیا: "کہو نہیں ڈارلنگ۔ حکم دو۔ آرڈی ننس جاری کرو۔"

رخشی بڑی آسودگی سے مسکرائی اور میز پر دونوں کہنیاں ٹیک کر بولی: "آج کل مختار مجھے بہت پریشان کر رہا ہے۔"

محمود نے ایک دم پیگ اپنے ہونٹوں سے ہٹا لیا اور پرلی طرف بیٹھے ہوئے مختار کی طرف گھورنے لگا۔ پھر وہسکی کی بوتل کو گردن سے پکڑ کر بولا: "کہو تو جا کر یہ بوتل اس کے سر پر توڑ دوں۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے مودی۔" رخشی کے لہجے میں پچکار سی تھی۔ "تم سنو تو مگر پہلے وعدہ۔ خفا تو نہیں ہو گے نا؟"

"یہ خفا خفا کی کیا رٹ لگا رکھی ہے رخشی؟" محمود خفا ہونے لگا۔ "تم سے خفا ہو کر کیا مجھے اپنا ہارٹ فیل کرانا ہے؟ بولو۔ جلدی سے بولو۔"

رخشی نے اپنی لمبی سڈول گردن آگے بڑھائی: "سنو کل مختار نے مجھے زبردستی کس کرنے کی کوشش کی۔"

محمود کا ہاتھ بوتل کی گردن کی طرف بڑھا مگر رخشی نے اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اس پر اپنا دوسرا ہاتھ پھیرنے لگی۔ "تم سنتے تو ہو نہیں۔ میں چاہتی ہوں ذرا دیکھیں مختار کتنے پانی میں ہے۔" پھر اس نے سرگوشی کی: "میں کل دو چار گھنٹے اس کے ساتھ شاہ بلوط ہوٹل میں گزارنا چاہتی ہوں۔ میں صرف ٹوہ لگانا چاہتی ہوں کہ نگینہ سے شادی کرنے کے بعد بھی وہ —— "

"ہاں ہاں!" محمود کو بھی کرید ہوئی۔ "اگر مختار نگینہ کی سی شہزادی سے شادی کر کے بھی ——"

"شہزادی؟" رخشی نے بھڑک کر محمود کی بات کاٹی۔ "شہزادی کیسے؟"

محمود ہنسا۔ "اری نہیں ڈارلنگ، سب اسے شہزادی کہتے ہیں نا۔ دراصل اس کی چال ڈھال میں جو دبدبہ ہے، اس کے ناک نقشے میں جو وقار ہے وہ صرف شہزادیوں میں ہوتا ہوگا۔ اگر مختار اس شہزادی لڑکی سے شادی کر کے بھی تمہیں پریشان کرتا ہے تو وہ تمہارے حسن کو اس سے بڑا خراج اور کیا ادا کرے گا۔ میں نے تمہیں کتنی بار بتایا ہے کہ نگینہ بہت خوبصورت سہی، بہت ہی خوبصورت سہی، بہت بہت بہت ہی خوبصورت سہی مگر جب وہ میری رخشی کے سامنے آتی ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے —— جیسے ——"

محمود اپنا ماتھا دبانے لگا۔ پھر بولا —— "جیسے وہسکی کے پیگ کے سامنے چائے کی پیالی رکھی ہو۔"

رخشی مسکرائی تو محمود بولا —— "جیسے کبوتری کے سامنے چڑیا بیٹھی ہو۔"

رخشی نے اب کے ہنسی پر بڑی مشکل سے ضبط کیا۔ اور محمود بولا: "جیسے بنگلے کے گوشے میں اینکسی کھڑی ہو۔"

اب کے رخشی ہنسی پر ضبط نہ کر سکی اور نتیجتاً پورے کلب کی گردنیں اس میز کی طرف مڑ گئیں جہاں رخشی اور محمود نے جیسے درآمد شو شروع کر رکھا تھا۔

"شریر!" رخشی نے ہاتھ بڑھا کر محمود کے گال کی یوں چٹکی لی جیسے اس کے سامنے دو چار برس کا بچہ بیٹھا ہے۔ پھر وہ تنک کر بولی۔ "شیو کب بنایا تھا؟ کئی بار کہا ہے کہ دو بار شیو بنایا کرو۔ ایک صبح کو ایک شام کو۔ لے کے میری بے چاری انگلیوں کی پوریں چھیل دیں!"

محمود اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کی پوروں کو چومنے لگا۔ پھر اس کے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ رکھ کر بولا: "اب کہو۔"

رخشی نے اس کے گالوں پر ہتھیلیاں ملتے ہوئے کہا: "بس میں صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ مختار شادی کے ایک ڈیڑھ مہینے بعد ہی نگینہ سے کیوں بدک اٹھا ہے۔"

"تم نے سائیکالوجی کا ایم اے تو کر لیا ڈارلنگ!" محمود بولا۔ "اب کیا مختار کی سائیکلوجی پر تھیسس لکھنا ہے؟"

رخشی کو سہارا ملا۔ "بس عادت سی ہو گئی ہے ہر شخص کے اندر گھس جانے کی۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں اس کے اندر کیا ہے۔ یاد ہے شادی سے پہلے، جب نگینہ کے ڈیڈی، ڈرنک پارٹی سے فارغ ہو کر نگینہ کو ساتھ لے جانے کے لئے لان میں گئے تھے تو مختار کا سا چھ فٹا، سرخ و سفید، چوڑا چکلا، اپالو کا سا ہینڈسم جوان نگینہ کے قدموں پر سر رکھے پڑا تھا اور جب نگینہ کے ڈیڈی نے اسے اٹھنے کو کہا تھا تو پتہ ہے اس نے کیا جواب دیا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ نہیں انکل ابھی نہیں۔ ابھی میرا سجدہ مکمل نہیں ہوا۔ یاد ہے وہ اپنے شاہ بلوط کلب کی کلثوم اور جبین کی سی لڑکیوں کو چھوڑ کر اس پام گروو کلب میں چوروں کی طرح آتا تھا اور مجنوں کی طرح اپنی لیلیٰ کیلئے سب کے سامنے باقاعدہ آنسوؤں سے روتا تھا۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ آخر ——"

"ہاں ہاں، کیا فرق پڑتا ہے ڈارلنگ۔" محمود نے چھٹے پیگ کے باقی نصف کو غٹ غٹ چڑھا کر کہا۔

اچانک اس کے تیور بگڑ گئے اور وہ خاصے جذبے سے بولا۔ "مگر یاد رکھو اگر بات اس سے آگے بڑھی تو میں مختار کو مار ڈالوں گا۔ وہ میرا دوست ہے مگر دوست ہی دوستوں کے ہاتھوں قتل ہوتے ہیں۔ قابیل نے تو اپنے بھائی ہابیل کو مار ڈالا تھا!"

"ہائیں مودی ڈیئر!" رخشی اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم اور ایسی جانوروں کی سی بات!"

پھر اُس نے جھک کر محمود کی ٹھوڑی کو انگوٹھے اور انگشتِ شہادت سے پکڑا
اور بچے کی طرح تتلا کر بولی" اچھے اچھے، منے منے، پیارے پیارے بچے ایسی
باتیں نہیں کہتے!"
محمود نے رخشی کا وہی ہاتھ پکڑ کر اس زور سے چوما کہ چٹاخ کی اس آواز سے
پورا کلب ایک بار پھر متوجہ ہو گیا۔
"تو پھر کل میں یہاں نہیں آ رہی ہوں" رخشی بولی۔
"صرف کل" محمود نے فیصلہ سنایا۔
"ہاں ہاں صرف کل" رخشی نے اتفاق کیا۔
"میری قسم کھاؤ" محمود نے مطالبہ کیا۔
"تمہاری قسم" رخشی فوراً بولی۔
"تو پھر ٹھیک ہے رخشی ڈارلنگ" محمود بولا "بس یہی ہوگا نا کہ کل میں آدھی
کی بجائے پوری بوتل پی لوں گا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے" پھر وہ گانے لگا اور ساتھ
ساتھ چٹکی بجانے لگا "کیا فرق پڑتا ہے جی کیا فرق پڑتا ہے!"

رخشی نے محمود سے صرف ایک رات کی چھٹی لی تھی مگر وہ دوسری رات بھی
نہ آئی۔ محمود نے پہلے ایک پیگ پیا مگر پھر پوری بوتل منگالی اور اس بوتل کو سامنے
رکھے وہ رخشی کا انتظار کرتا رہا۔ وہ دیر تک یوں ہی بیٹھا رہا اور کلب کے دوسرے
ممبر اسے کنکھیوں سے دیکھتے اور محظوظ ہوتے رہے۔ پورے کلب سے رخشی
کو چھین کر محمود نے کچھ ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ بھرے ہوتے ہال اور بار کے کاؤنٹر
پر جمع ہجوم اور ساتھ کے کمروں اور بلیرڈ روم سے کوئی بھی اس سے یہ پوچھنے نہ آیا
کہ آج وہ ڈوبا ہوا کیوں ہے، طلوع کیوں نہیں ہو رہا ہے' وجہ سبھی کو معلوم تھی۔ کلب

میں رخشی کا نہ آنا کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ سمجھتے سب تھے مگر سب خاموش تھے
اور اس خاموشی سے ہراساں بھی تھے جیسے کوئی طوفان ٹوٹنے والا ہے۔
یہ حیرت اور ہراس بس پہلی رات تک تھے۔ وہ حیران ہوتے رہے کہ محمود
نے بیرے کو بلا کر بوتل کھلوائی اور پیگ پر پیگ چڑھانے لگا۔ اور ہراساں تھے کہ بوتل
ختم ہونے والی تھی اور اب محمود نیا پیگ بنانے کے لئے گلاس میز پہ رکھتا نہیں تھا
بلکہ دے مارتا تھا۔ ابھی وہ اٹھے گا اور جو پہلا شخص اس کے سامنے آئے گا اسے
گریبان سے پکڑ کر اس پہ گولیوں کی بوچھاڑ کر دے گا۔ شرابیوں کے آؤٹ ہونے
کے اپنے اپنے اسلوب ہوتے ہیں۔ کوئی ایک دم چپ ہو جاتا ہے۔ کوئی دُنیا
کی بے ثباتی پر زار زار رونے لگتا ہے۔ کوئی اپنے پاس بیٹھے ہوئے شخص کے
قدموں پر یہ کہتے ہوئے گر جاتا ہے کہ وہ کتنا بے مثال آدمی ہے اور کوئی چیزیں توڑنے
اور کھوپڑیاں پھوڑنے میں لگ جاتا ہے۔ محمود آؤٹ ہونے کے بعد یہی کچھ کرتا تھا۔
پہلی رات تو اس نے عالیہ تک کو کوئی لفٹ نہ دی جو رخشی سے پہلے محمود کی
بلاناغہ کی ساتھی تھی۔ آج میدان خالی دیکھ کر وہ اس کی طرف یوں والہانہ انداز سے
بڑھی جیسے اس کا لباس کہیں پیچھے رہ جائے گا اور وہ آگے بڑھ جائے گی۔ آج تو وہ
یوں سج سجا کر آئی تھی کہ اپنے آپ سے بھی نکلی پڑ رہی تھی۔ وہ آئی اور محمود کے اتنے
قریب جا کھڑی ہوئی کہ کسی اور کے اتنا قریب جاتی تو وہ اس کے ننگے پیٹ پر
اپنے ہونٹ رکھ دیتا۔ مگر محمود نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا، اٹھا اور بار کے کاؤنٹر
کی طرف ٹہل گیا۔ پھر جب عالیہ نہایت غصے میں پلٹی تو وہ مسکراتا ہوا اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔
کلب میں سب کی نظریں اِدھر رخشی کے انتظار میں اندر باہر کھلنے والے نیم
دروازے پر اور اُدھر محمود کے غیر منطقی اطمینان کی وجہ سے محمود پر لگی تھیں۔ بس اتنا ہوا
کہ اس رات جب محمود اٹھا تو خطِ مستقیم میں چلنا اس کے لئے مشکل ہو رہا تھا اور نہ وہ

کسی سے اُلجھا نہیں۔ جب وُہ چلا گیا تو ایک میز کے گرد بیٹھے ہوئے لوگوں نے کورس میں گانا شروع کر دیا تھا "کوئی فرق نہیں پڑتا جی کوئی فرق نہیں پڑتا" پھر جب وُہ چیخ چیخ کر قہقہے لگا رہے تھے تو نیم دروازے پر سے محمود کا سر نمودار ہوا۔ پُورے کلب پر جیسے سناٹے کی جھاڑو پھر گئی اور محمود جیسے مطمئن ہو کر واپس چلا گیا۔

جب رخشی دوسری رات بھی نہ آئی تو سب کو تشویش لاحق ہوئی مگر جب محمود کو اپنے سامنے وہسکی کی بوتل رکھے، بت بنے بیٹھا دیکھا تو آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے کہ لو، چوروں پر مور پڑ گئے۔

اور یہ اسی دوسری رات کا واقعہ ہے کہ جب بہت دیر ہو گئی تو محمود کے بت میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ اٹھا۔ اس نے بوتل کو گردن سے پکڑ کر فرش پر دے مارا اور سب لوگ یوں چونک پڑے جیسے کلب میں بم پھٹ گیا ہے۔ محمود دونوں ہاتھ کمر پر رکھے یوں کھڑا تھا جیسے اس نے بوتل نہیں توڑی، مختار کو قتل کر دیا ہے اور فرش پر شراب نہیں بہہ رہی ہے، رخشی، مختار کے چنگل سے نکل کر اس کی طرف لپکی آ رہی ہے۔

"یہ بوتل میری تھی،" اس نے آس پاس جمع ہوتے ہوئے کلب کے اہلکاروں کو ڈانٹا۔ "یہ میری مرضی ہے کہ میں اسے پیوں یا توڑ دوں یا کسی کے سر پر دے ماروں!"

سب چپ چاپ پلٹ گئے اور محمود اندر باہر کھلنے والے دروازے میں سے اس تیزی سے نکلا کہ دروازہ دیر تک اندر باہر کھلتا رہا۔

اور یہ بھی اسی رات کا ذکر ہے۔ رخشی شام سے مختار کے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ وہ محمود کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرنا چاہتی ہے، مگر مختار نہیں مانتا تھا۔ "وہ مجھے یا تمہیں مار ڈالے گا رخشی ڈیئر" وہ کہتا رہا۔ "وہ میرا پُرانا یار ہے۔ میں اسے پوری طرح جانتا ہوں۔ شکست کھانا تو اسے آتا ہی نہیں۔ اسی لئے تو وُہ اب کے الیکشن میں بھی

کھڑا نہیں ہوا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ووٹر غلط باتیں کرنے لگے ہیں اس لئے وہ ہار جائے گا اور وہ ہارنے کی بجائے مارنا یا مر جانا بہتر سمجھتا ہے۔ اس نے مجھے بھی الیکشن لڑنے سے روکا تھا، مگر میں لڑا اور ہار گیا۔ اس کی سیاسی بصیرت بہت تیز ہے۔ اس کی سبھی بصیرتیں بہت تیز ہیں اور اپنی انہی بصیرتوں کو کند رکھنے کے لئے تو اتنی بہت سی پیتا ہے۔ دراصل وہ اپنے آپ سے ڈرتا ہے کہ وہ ہوش میں رہے گا تو نہ جانے کیا کر بیٹھے گا۔ سو ڈیئر، اسے آگاہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایسے حالات میں آدمی کو آگاہی خود بخود ہو جاتی ہے۔ تم محمود کے پہلو میں تھیں، مگر مجھے آگاہی حاصل ہوئی کہ اندر سے تم میری ہو۔ محمود کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ اندر سے تم اس کی نہیں تھیں۔ تب وہ کوئی نہ کوئی خطرناک حرکت ضرور کرے گا اس لئے میرا خیال یہ ہے کہ ہمیں کراچی چھوڑ کر لاہور چلے جانا چاہیئے۔"

"مگر تمارے پیارے۔" رخشی نے کہا۔ "اس نے مجھ سے عشق کیا ہے۔ وہ میرے بغیر پاگل ہو جائے گا۔ میں اسے ایسی موت مرتا نہیں دیکھ سکتی کہ ایک لکھ پتی کو گلیوں کے بچے پتھر مارتے پھریں۔ اگر تم مجھے نہ ملتے تو دُنیا کا کوئی بھی مرد مجھے محمود سے نہیں چھین سکتا تھا۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتی ہوں کہ وہ میرے بغیر کیسا ہے۔ میں چاہتی ہوں اسے معلوم ہو جائے کہ اب اسے میرے بغیر زندگی گزارنا ہو گی۔ منہ سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ بس ہم بازو میں بازو ڈالے اس کے سامنے سے گزر جائیں گے اور وہ سب سمجھ جائے گا۔ وہ بڑا ذہین ہے۔ اس کی بصیرتیں بہت تیز ہیں۔"

"بشرطیکہ آؤٹ نہ ہوا۔" مختار نے کہا۔ "آؤٹ ہوا تو وہ کچھ نہ کچھ کر بیٹھے گا۔"

رخشی بولی "معلوم ہوتا ہے تم اسے جانتے تو ہو مگر ٹھیک سے نہیں جانتے۔ وہ شور بہت مچاتا ہے مگر آؤٹ بہت کم ہوتا ہے۔ شراب کی عادت ہو گئی ہے۔

شراب وہ اسی طرح پیتا ہے جیسے چلتا ہے یا سانس لیتا ہے۔ چلو اٹھو۔“

اندر باہر کھلنے والا دروازہ اندر کھلا تو کلب میں ایک بار پھر ایسی فضا پیدا ہو گئی جیسے محمود نے بوتل فرش پر دے ماری ہے۔ رخشی اور مختار شناساؤں سے ہیلو ہیلو کہتے جب محمود کی خاص میز کے پاس پہنچے تو ایک ویٹر طشت میں بوتل کی کرچیاں جمع کر رہا تھا۔

رخشی جیسے سب سمجھ گئی۔ ویٹر سے پوچھا ”یہ بوتل محمود نے خود توڑی یا ٹوٹ گئی؟“

”خود توڑی جی۔“ ویٹر بولا۔ ”کھینچ کر فرش پر دے ماری اور اُٹھ کر چلے گئے۔“

رخشی نے ایک لمحہ سوچا۔ پھر بولی۔ ”تو پھر تارے پیارے۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں اس سے نہیں ملنا چاہیئے۔“

وہ روزانہ ایک ہوٹل بدلتے تھے اور اب تک چار ہوٹل بدل چکے تھے۔ پانچویں ہوٹل میں قدم رکھتے ہی مختار بولا۔ ”رخشی ڈیئر۔ میرا جی چاہتا ہے میں نگینہ کو دیکھوں کہ وہ میرے بغیر کیسی ہے۔ یقین کرو ڈیئر، اگر مجھے تم نہ ملتیں تو میں دُنیا کی کسی بھی عورت کے لئے نگینہ کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ میں اسے کبھی کبھی گریٹ بیوٹی کہتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ رخشی کے رُوپ میں ایک سپریم بیوٹی بھی موجود ہے۔“

”یہ تو میں مانتی ہوں۔“ رخشی بولی۔ ”خوبصورت تو وہ بلا کی ہے اور یاد رکھو۔ میں دُنیا کی پہلی عورت ہوں جو دوسری عورت کی خُوبصورتی کا اعتراف کر رہی ہے ——“ یہاں رخشی نے اپنی ہنسی کا اعجاز دکھایا —— ”بس تم نے اس کی جو باتیں مجھے بتائی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنا خوبصورت اس کا جسم اور چہرہ ہے، اتنا ہی بھونڈا اس کا دل اور دماغ ہے۔ ویسے یاد رکھو وہ بھی محمود کی طرح تمہیں اور مجھے قتل کر سکتی ہے۔

جو بیوی اپنے شوہر کو صبح تھپڑ مار کر جگائے اور ٹھوکر مار کر اُٹھائے، وہ سب کچھ کر سکتی ہے۔“

”اور پھر کہتی ہے کہ میں نے تو پیار سے تھپڑ مارا، مَیں نے تو پیار سے ٹھوکر ماری“ مختار بولا۔

”تو پھر وہ پیار سے ریوالور کی گولی بھی اتار سکتی ہے دوسرے کے سینے میں۔“ رخشی نے کہا۔

”نہیں ایسی بات نہیں۔“ مختار نے رخشی کی تردید کی۔ ”ایسے معاملات میں گولی انہیں ماری جاتی ہے جن سے محبّت کی جاتی ہے۔ اس سے محبّت میں نے کی ہے۔ اس نے نہیں کی اور وہ ایسی پاگل نہیں کہ راہ چلتے کو گولی مار دے۔ دیکھو نہ ڈیئر۔ ہم چار پانچ روز سے ہوٹلوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں اور سب فائیو سٹار ہوٹل ہیں۔ اسے تشویش ہوتی تو وہ کسی ہوٹل سے میرے بارے میں پوچھتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے نکاح کے وقت اپنا جو بنگلہ اس کے نام منتقل کرا دیا تھا تو وہ اسی پہ صابر و شاکر ہو گئی ہے۔“

”تو پھر تمہیں یہ دیکھنے کا شوق کیوں ہے کہ وہ تمہارے بغیر کیسی ہے۔“

”جیسے تمہیں محمود کو دیکھنے کا شوق تھا۔“

”مگر وہ شوق تو محمود کو دیکھے بغیر پورا ہو گیا۔“ اور یہ کہہ کر رخشی نے اپنی ہنسی کے ذریعے چاندی کی ننھی ننھی گھنٹیاں بجائیں۔

مگر پھر یوں ہوا کہ گھنٹیوں کی یہ آوازیں بیچ ہی میں کٹ کر رہ گئیں جیسے کسی دیوانے تڑپتی ہوئی گھنٹیوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔

سامنے کے دروازے میں سے محمود اور نگینہ، بازو میں بازو ڈالے ہال میں داخل ہوئے۔ دونوں کے لبوں پر وہ مسکراہٹیں تھیں جو آنکھوں کو بھی چمکا دیتی ہیں اور چہروں

کو بھی دمکا دیتی ہیں۔

مختار اور رخشی دونوں جیسے بجلی کے ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور جب وہ اُٹھے، تو محمود اور نگینہ کے قدم جیسے فرش کی ٹائلوں نے پکڑ لئے۔ طرفین ایکدوسرے کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے برسوں کے بعد ملے ہیں تو پہچاننے میں دقّت ہو رہی ہے۔

پھر ادھر سے مختار اور رخشی اور ادھر سے محمود اور نگینہ ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ رخشی محمود سے خوف زدہ ہے اور مختار نگینہ سے۔

مگر پھر یوں ہُوا کہ محمود نے قریب آ کر کہا "ہیلو مختار" اور رخشی کے بازو میں بازو ڈال کر پلٹا تو مختار بولا۔ "ہیلو"

"ہیلو" نگینہ نے بازو اُٹھائے بغیر جیسے اپنا پورا جسم مختار کے جسم میں پیوست کر دیا اور پھر اس کے بازو میں بازو ڈال کر دوسری سمت چل پڑی۔

سارا معاملہ یوں چپ چاپ طے پا گیا جیسے دونوں مال کا تبادلہ کرنے آئے تھے۔

۱۹۷۵ء

ایک عورت تین کہانیاں

میں گاؤں کی ننھی سی ایک بچّی ہوں۔ میرا نام نورخاتون ہے۔ میں نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی ہے کہ اگر خدا نے میری پیدائش کے فوراً بعد مجھے عقل و شعور سے بہرہ ور کر دیا ہوتا تو میں ایک ہولناک چیخ مار کر مر جاتی۔ میں اشرف المخلوق کے ایک فرد کی حیثیت سے دُنیا میں آتی تھی۔ مگر میں نے جس کوٹھے میں جنم لیا، وہ موت کی طرح تاریک تھا۔ اس کے ایک کونے میں میرے بابا کی اکلوتی بکری بندھی تھی جو بیٹھے بیٹھے تھک جاتی تھی اور اُٹھ کر ایک جھرجھری سے اپنا جسم جھاڑتی تھی تو اس کی غلاظت اُڑ کر میری چیختی ہوئی ماں کے بالوں میں اٹک جاتی تھی۔ میرے پیدا ہوتے ہی دُنیا کی جس پہلی چیز نے میرا استقبال کیا وہ اس غلاظت کا ایک چھینٹا تھا، جو سیدھا میرے ماتھے پر آ گرا اور میری تقدیر لکھ گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے بعد میرے کان میں اذان بھی دی گئی اور مجھے چیتھڑوں میں لپیٹ بھی لیا گیا مگر غلاظت کا چھینٹا اس سے پہلے ہی اپنا کام کر چکا تھا۔

میری آمد پر میری ماں دنوں تک روتی رہی۔ میرے بابا نے بھی مجھے دیکھا، تو ایسا لٹا لٹا نظر آ رہا تھا جیسے اس کی بکری اچانک کھڑی کھڑی ڈھیر ہو گئی ہے۔ عورتیں میری ماں کے ساتھ یوں اظہارِ ہمدردی کرتی تھیں جیسے اس کے ہاں کوئی پیدا نہیں ہُوا ہے،

کوئی مر گیا ہے۔ اس کے باوجود میں اپنی ماں کی آنتوں کا ایک ٹکڑا تھی۔ وہ مجھے سینے سے چمٹائے رکھتی اور میری ننھی ننھی ٹھوڑی کو اپنی ایک انگلی کی پور سے دبا دبا کر مجھے ہنسانے کی کوشش کرتی رہتی، پھر جب میں مسکرانے لگتی تو وہ رونے لگتی اور میرے بابا سے کہتی: "اس کی طرف دیکھو، میں نے اس کی ٹھوڑی کو ذرا سا چھُو لیا تو مسکرانے لگی۔ اللہ رحم کرے، یہ مسکراتی بہت ہے۔"

چند دنوں کے بعد میری ماں نے چارپائی سے اُتر کر بکری کی مینگنیاں سکھانا، دودھ بیچنا، دال ابالنا، اور روٹیاں پکانا شروع کیا، تو میں ایک فالتو چیز بن کر رہ گئی۔ اتنی فالتو کہ ایک بار تو بابا مجھ پر بیٹھتے بیٹھتے رہ گیا۔ بیٹھ جاتا تو میں روئی کا ذرا سا گالا ہی تو تھی، پچک کر رہ جاتی، مگر بابا بیٹھنے کو جھکا ہی تھا کہ ماں نے چیخ ماردی اور وہ تڑپ کر سیدھا ہو گیا۔ پھر اس نے کہا: "توبہ ہے، میں سمجھا کوئی چیتھڑا پڑا ہے۔ یہ کمبخت کیسی ہے کہ روتی بھی نہیں۔" اور ماں نے کہا تھا: "بیٹیاں بیچاری تو بڑی صابر ہوتی ہیں۔ روتے تو بیٹے ہیں۔"

گرتی پڑتی میں اتنی بڑی ہو گئی کہ بیٹھے بیٹھے پورے صحن میں گھوم آتی تھی۔ مجھے جو چیز بھی ملتی اسے پکڑ کر منہ میں ڈال لیتی مگر ان دنوں میرے منہ میں کچھ گیا تو وہ کنکر تھے یا بھُوسے کے تنکے، بکری کی مینگنیاں یا مٹی کے ڈھیلے۔ گھر میں اور تھا ہی کیا کہ میرے قبضے میں آتا۔ ایک بار چولہے میں سے انگارہ اٹھا کر بھی چکھنا چاہا مگر ماں نے میرے بڑھے ہوئے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مارا اور گالیاں دینے لگی اور رو رو کر میرے بابا سے کہنے لگی کہ بیچاری کے لئے ایک آنے کا جھنجھنا لا دو۔ مگر بابا بولا: "ایک آنہ ہوتا تو تمباکو نہ لے آتا۔ دیر سے حقّے کے لئے ترس رہا ہوں۔"

اب میں سات آٹھ برس کی ہوں۔ ہمارے پڑوس میں چودھری پیراں دتّہ کا گھر ہے، جس کی بیٹیوں کے پاس انگریزی گڑیاں ہیں جو لیٹتی ہیں تو آنکھیں بند کر لیتی ہیں اور

اٹھتی ہیں تو ٹکر ٹکر گھورنے لگتی ہیں اور ان کے سنہری بال ہیں اور گالوں پر لالی ہے۔ ماں نے مجھے بھی کپڑے کی ایک چپٹی سی گڑیا بنا کر دی مگر یہ چودھرانیاں کہتی ہیں کہ میری گڑیا ان گڑیوں کی میراثن ہے۔ اسی لئے میری ان کی دوستی نہیں ہو سکی۔ میری دوستی تو توگامے موچی کی بیٹی تارو سے ہے جو ننگے پیر رہتی ہے۔ ایک بار میں نے کہا: "موچی ہو کر ننگے پیر رہتی ہو۔ یہ بھی کیا بات ہوئی!" وہ بولی: "وہی بات ہوئی جیسے تم کسان کی بیٹی ہو کر بھوکی رہتی ہو۔" میرا اس کا حساب برابر ہو گیا اس لئے میری اس کی دوستی ہو گئی۔

میں دوسری لڑکیوں کی طرح مدرسے نہیں جاتی۔ بابا مجھے قاعدہ، قلم، تختی، سلیٹ خرید کر نہیں دیتا۔ کہتا ہے کہ "بیٹی تمہیں منشیانی نہیں بننا ہے۔ اپنی ماں کی طرح مینگنیاں سکھانی ہیں۔ یہی تمہاری نانی دادی نے کیا۔ یہی ان کی نانیوں دادیوں نے کیا اور پھر اگر میرے پاس تختی سلیٹ کے پیسے ہوتے، تو میں دوسری بکری نہ خرید لیتا؟"

میں صبح سویرے گھر میں جھاڑو دیتی ہوں۔ بکری کے تھان صاف کرتی ہوں۔ کنوئیں پر سے پانی کی گگریا بھر لاتی ہوں۔ جنگل میں جا کر جھاڑیوں کی خشک ٹہنیاں توڑ لاتی ہوں۔ مائی جی سے روزانہ نماز کا سبق لیتی ہوں۔ آج کل میرا سبق ہے صراط الذین انعمت علیہم۔ وہ کون سا کام ہے جو کسان عورتیں کرتی ہیں اور میں نے اس عمر ہی میں نہ کر لیا ہو۔ میں نے مٹی کھودی ہے، گھاس کاٹی ہے، دیواریں لیپی ہیں۔ میرے ہاتھوں پر گٹے ہیں۔ میری ایڑیوں میں دراڑیں ہیں، میرے بالوں میں دھول ہے۔ میری آنکھوں میں آنسو ہیں۔ میرے ہونٹوں پہ پپڑیاں ہیں اور پچھلی چودہ پندرہ عیدوں میں میری ہتھیلیاں مہندی کے ایک دھبے تک کے لئے ترستی رہی ہیں۔

(۲)

میں گاؤں کی ایک کنواری ہوں۔ میرا نام نور خاتون ہے۔ میرے کپڑے مٹیالے ہیں مگر میری آنکھوں میں چراغوں کی لویں کانپتی ہیں۔ میرا کُرتہ جگہ جگہ سے

مسک گیا ہے مگر میرے چہرے پہ حیا کی گلابی چادر ہے۔ میرے سر پر لانبی گھاس کا من بھر گٹھا ہے مگر میرے ہونٹوں پہ ہلکے پھلکے گیت ہیں۔ میں ایک اپنے بابا ہی کی نہیں، سارے گاؤں کی عزّت ہوں مگر کیا کروں کہ آخر ایک عورت ہوں اور صدیوں سے عورت کو دیکھتے رہنے والے مرد اسے اب تک یوں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہیں، جیسے میں بچپن میں ہوائی جہاز کو دیکھتی تھی۔ میں جانتی ہوں کہ میں گاؤں کی پہلی گلی میں داخل ہوتے ہی بیسیوں نگاہوں کا نشانہ بن جاؤں گی اور نگاہوں کے اس ہجوم میں لڑکھڑانے لگوں گی۔ گاؤں میں اور جوان لڑکیاں بھی ہیں اور مرد انہیں بھی دیکھتے ہیں مگر یوں ہجوم کر کے نہیں دیکھتے جیسے مجھے دیکھتے ہیں۔ مجھ پر نگاہوں کی اس یلغار کے دو سبب ہیں، ایک تو یہ کہ تارد نے مجھے بتایا ہے کہ میں خوبصورت ہوں۔ خود تارد بھی خوبصورت ہے مگر وہ کہتی ہے کہ کسانوں تک آ کر خوبصورتی ختم ہو جاتی ہے اور موچنیں، نائنیں، دھوبنیں، میراثنیں اور کمہارنیں خوبصورت نہیں ہوتیں۔ وہ صرف موچنیں نائنیں، دھوبنیں، میراثنیں اور کمہارنیں ہوتی ہیں۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ میرا بابا پچھلے سولہ سترہ سال سے بدستور ایک ہی بکری کا مالک ہے اور گاؤں کی چوپال پر جا کر چپ چاپ بیٹھا رہتا ہے کیونکہ غریب ہونے کی وجہ سے اس کی بات میں وزن نہیں ہوتا۔

گھاس کا گٹھا اُتار کر وہ سب کام کروں گی جو میری ماں اور اس سے پہلے اس کی ماں اور اس سے بھی پہلے اس کی ماں کرتی رہی ہے۔ میں چولھا پھونکوں گی، پڑوس کے چودھریوں سے گائے بھینس کا گوبر مانگنے جاؤں گی اور اگر مل گیا تو اُپلے تھاپوں گی، جھاڑو دوں گی، گارا بناؤں گی۔ چھت اور دیواریں لیپوں گی، بابا کے لئے حکیم جی سے ادھار عرق لاؤں گی۔ ماں کے لئے پیر جی سے ادھار تعویذ حاصل کروں گی، پھر جب رات کو چیتھڑوں کے انبار میں سونے کی کوشش کروں گی تو میرے ماں اور بابا آپس میں کھسر پھسر کریں گے۔ وہ کچھ ایسی باتیں کریں گے جیسے میں ان کی بیٹی نہیں ہوں، میّت

ہوں اور وہ میری شادی کا نہیں سوچ رہے ہیں، میرا جنازہ اٹھانے کی فکر میں ہیں۔

اس وقت میری ماں میرے بابا کو بتائے گی کہ وہ اپنی شادی پر چاندی کے جو کنگن لائی تھی وہ اس کی بیٹی کے جہیز کے لئے محفوظ پڑے ہیں۔ یہ کنگن میری ماں کو اس کی ماں نے دیئے تھے اور اسے اس کی ماں نے دیئے تھے اور کہتے ہیں کہ یہ کنگن اس زمانے کے ہیں جب پنجاب پر سکھوں کا راج تھا اور دِلّی کا بادشاہ جیتے جی مر گیا تھا۔ پھر بابا بتلائے گا کہ وہ اپنی بیٹی کی خاطر بکری بیچ دے گا اور گزر بسر کے لئے کھیتوں پر مزدوری کرے گا یا چوہدری کے جو نئے مکان بننے والے ہیں ان کے لئے گارا ڈھوئے گا۔

میری ماں روتے روتے کھانسنے لگے گی تو پانی میں پیر جی کا تعویذ گھول کر پی جائے گی۔ میرا بابا رونے پر ضبط کرتے کرتے ہانپنے لگے گا تو عرق کا ایک گھونٹ چڑھا لے گا اور میں یوں محسوس کروں گی جیسے میں جوان نہیں ہوتی ہوں، مر گئی ہوں۔ میں ایک بہت گہری، بہت ہی گہری قبر کے کنارے پہنچ گئی ہوں اور میرے ماں اور بابا مارے محبت کے مجھے اس میں دھکا دینے والے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں اس کنوئیں کی سی قبر کے دوسرے سرے پر وہ سورج نکل آئے گا جو کبھی نہیں ڈوبتا۔

میں عجیب عجیب باتیں سوچتی ہوں۔ میں کسے بتاؤں کہ میں کیسی کیسی باتیں سوچتی ہوں۔ میں تارد موچن سے سب کچھ کہہ کر اپنا جی ہلکا کر لیتی مگر وہ تو سال بھر پہلے بیاہ دی گئی اور ابھی چند روز پہلے اپنے مردہ بچّے کے ساتھ ہی مر گئی۔ ایک بار جب اسے ہوش آیا اور اسے پتہ چلا کہ اس کے ہاں تو مردہ بچّہ پیدا ہوا ہے تو وہ چیخنے لگی۔ "لاؤ میرا بچّہ لاؤ۔ میں اس میں اپنی جان پھُونک دوں گی۔ میں اپنے بچّے سے اس کی موت لے لوں گی اور اسے اپنی زندگی دے دوں گی۔ میرا خُدا بڑا اچھا ہے۔ اس کو اس سودے پر کیا اعتراض ہوگا!" پھر وہ مردہ بچّے سے چمٹ گئی اور مر گئی مگر بچّہ زندہ نہ ہو سکا۔

پڑوس کی ایک لڑکی کی شادی پر میں نے دوسری بہت سی لڑکیوں سے مل کر گیت گائے تھے تو نمبردار کی بیٹی چونک پڑی تھی اور اس نے سونے کی چوڑیوں سے لدی ہوئی بانہہ اٹھا کر سب کو خاموش کر دیا تھا اور مجھ سے کہا تھا "اب تُو گا نورییے! کوئی اور نہ گائے۔ صرف نوری گائے گی۔ اس کی آواز میں پیتل کا کٹورا بجتا ہے!" پھر میں نے الگ سے گایا تو رونے لگی اور بولی "ہائے ری اور گا۔ گاتی جا۔ تیری آواز میں تو چھریاں کھنکتی ہیں!" پھر نہ جانے کیا ہوا کہ گاتے گاتے میں خود بھی رونے لگی اور یوں آنسوؤں کے تاروں نے نمبردار کی بیٹی کو اور مجھے دوستی کے بندھنوں میں جکڑ لیا۔

مگر پھر یہ دوستی عجیب طرح ٹوٹی۔ ایک روز جب میں اس کے پاس بیٹھی ہوئے ہوئے گا رہی تھی اور وہ رو رہی تھی تو مجھے بھی رونا آ گیا۔ اب میں کیا بتاؤں کہ مجھے رونا کیوں آیا۔ بس یونہی میرا جی چاہا کہ رونا چاہیئے ورنہ میرا دم گھٹ جائے گا۔ تب یوں ہوا کہ اس نے آنچل سے اپنے آنسو پونچھے، اٹھی اور واپس آ کر مجھے پانچ روپے دیئے کہ جا ان سے ایک کُرتے کا کپڑا خرید لے۔ مجھے ایسا لگا کہ اس نے میرے گانے کے جواب میں مجھے گالی دی ہے۔ مَیں نے صرف اتنی سی بات کہی کہ بی بی تو نے اپنے آنسو تو آنچل سے پونچھے اور میرے آنسو پونچھنے کے لئے پانچ روپے اٹھا لائیں! کیوں؟ کیا میرے آنسو فالتو ہیں؟ مَیں نے یہ کہا اور پھر وہاں سے اُٹھ کر چلی آئی۔

اب میں اکیلی ہوں۔ میرے ماں اور بابا بھی اب مجھ سے کوئی بات نہیں کرتے۔ وہ مجھے صرف دیکھتے ہیں اور سوچتے ہیں۔ اور پھر میں وضو کر کے نماز پڑھنے لگتی ہوں اور نماز پڑھتے ہوئے سوچتی ہوں کہ میری جوانی بھی عجیب جوانی ہے کہ میرے ہونٹ سُرخ تو ہیں مگر شعلوں کی طرح سُرخ ہیں۔ میری آنکھوں میں چمک تو ہے مگر ریت بھی تو چمکتی ہے۔ میری رگوں میں خون کی جگہ آنسو دوڑتے ہیں اور میں اُوپر سے سانس لے رہی ہوں مگر اندر سے چیخ رہی ہوں۔

(۳)

مَیں گاؤں کی ایک عورت ہوں۔ میرا نام نور خاتون ہے۔ میں بہت دُکھی ہوں۔ میں اس لئے بھی بہت دُکھی ہوں کہ میری پانچوں بیٹیاں زندہ ہیں اور میرا گھر والا مکان کی چھت کے لئے مٹی کھودتے ہوئے مٹی کے ایک تودے تلے دب کر مر گیا ہے۔ جب اس کی لاش گھر میں لائی گئی تو اس کے نتھنوں اور کانوں اور آنکھوں میں مٹی بھری ہوئی تھی اور اس کے ہونٹوں سے خون کی ایک دھار نکل کر آس پاس کی مٹی میں آ کر مل گئی تھی اور مٹی کا عجیب سا رنگ ہو گیا تھا جیسے گرہن لگے تو چاند کا رنگ ہو جاتا ہے۔ میرے اکلوتے بیٹے کا بھی یہی رنگ ہے۔ وہ گاؤں کے ایک بڑے آدمی کا مزارعہ ہے۔ اس کی زمینوں پر ہل بھی چلاتا ہے۔ اس کے لئے لکڑیاں بھی کاٹ لاتا ہے، اسے مرغیوں کے انڈے بھی جمع کر کے دیتا ہے، وہ سفر پر جائے تو اس کا تھیلا اٹھا کر اس کی گھوڑی کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہے۔ وہ تھک جاتے تو اس کا جسم دابتا ہے۔ ایک روز کہہ رہا تھا کہ ان لوگوں کے جسم گوشت سے نہیں ریشم سے بنے ہوتے ہیں۔ ذرا سا بے وقوف ہے لیکن محنتی ہے۔ اس لئے مجھے اس کی بے وقوفی کھلتی نہیں۔

ایک دن اس نے کہا تھا "ماں بہن ویسے تو بڑی پیاری چیز ہے مگر یہ کیا بات ہے کہ جب میں اپنی پانچ بہنوں کو دیکھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میرے سینے میں پانچ چاقو اترے ہوتے ہیں۔ ماں انہیں زیادہ باہر نہ جانے دیا کرو، ماں انہیں چھت پر نہ چڑھنے دیا کرو۔ ماں انہیں کسی کوٹھے میں بند کر دو۔ ماں انہیں کسی ستون سے باندھ دو۔ ماں انہیں زہر دے کر مار ڈالو۔ میں ان کی شادیاں نہیں کر سکوں گا۔ شادیاں نہ کر سکا تو ان پہ پہرے نہ دے سکوں گا۔ پہرے نہ دے سکا تو میں گاؤں والوں کی باتیں نہیں سن سکوں گا اور پھر یا مار ڈالوں گا یا مر جاؤں گا۔"

میرا بیٹا پاگل نہیں ہے۔ وہ ذرا سا بے وقوف ہے۔ چھوٹا تھا تو اچھا بھلا سیانا تھا۔ پھر جب اسے عقل آنے لگی تو بے وقوفی کی باتیں کرنے لگا۔ وہ کہتا تو سچ ہے مگر سچی بات ہی بے وقوفی کی بات ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے جس گھر میں ایک وقت سوکھی روٹی پر اور دوسرا وقت بُھنے ہوئے دانوں پر بسر ہوتی ہو، وہاں جہیز کہاں سے آئے گا اور جہیز نہیں ہوگا تو بر کہاں سے آئے گا —— وہ سچ کہتا ہے۔ غریب لڑکے موجود ہیں مگر وہ اپنے سے بھی زیادہ غریب لڑکیوں سے کیوں شادی کریں۔ ہم سے بھی زیادہ غریب گھرانے موجود ہیں۔ یہی ہمارا پڑوسی احمد دین ہے۔ اس کے صحن میں دو بیریاں ہیں۔ بیر پکتے ہیں تو وہ ان بیروں کو جمع کر کے سکھا لیتا ہے اور جب غلے کا توڑا پڑتا ہے تو ان خشک بیروں کو اکھلی میں کوٹ کر مٹھی مٹھی سارے گھر والوں کو بانٹ دیتا ہے اور سونے سے پہلے "شکر الحمد للہ" کہتا ہے۔ احمد دین بڑا سیانا ہے۔ میرا بیٹا ذرا سا بے وقوف ہے۔ وہ کہتا ہے اپنے سے بھی غریب گھر میں تو میں اپنی بہنیں کبھی نہ بھیجوں تو پھر میں کیا کروں! اے خُدا، میں کیا کروں —— اے انسانو، میں کیا کروں؟

کاش میں پیدا ہوتے ہی مر جاتی۔ کاش میں تارو موچن ہوتی اور اپنے پہلے مردہ بچّے کے ساتھ ہی قبر میں اُتر جاتی۔ میں نے اتنی لمبی زندگی کو پاکر کیا پایا۔ میں تو سوچتی ہوں کہ بظاہر میں آدھی صدی کی سہی مگر میری عُمر تو کل ایک سال کی ہے۔ وہ ایک سال جو میں نے شادی کے بعد اپنے گھر والے کے ساتھ بچّوں کے بغیر بسر کیا۔ پھر بچّے آنے لگے۔ ہر بچّے کے ساتھ میرا گھر والا مجھُ سے پیچھے ہٹتا گیا اور آخر اتنا ہٹ گیا کہ چھپ گیا۔ مولوی جی کہتے ہیں کہ لوحِ محفوظ میں یہی لکھا تھا۔ میں سوچتی ہوں جب لوحِ محفوظ پر میری قسمت لکھی جا رہی تھی تو کیا فرشتوں کا قلم ٹوٹ گیا تھا۔

نمبردار کی بیٹی اب کسی افسر کی بیگم ہے۔ سبز رنگ کی کوٹھی جتنی لمبی کار میں

ایک بار گاؤں آئی تو کار کو گاؤں کی بڑی گلی میں گھُسا لائی۔ میں سر پر دو گھڑے رکھے پانی بھرنے جا رہی تھی۔ بولی: "کیسی ہو؟" اس نے یہ سوال یوں پوچھا جیسے کہہ رہی ہے کہ بدنصیب! اس روز مجھ سے پانچ روپے کیوں نہیں لے لئے تھے کہ تیری بگڑی بن جاتی۔ میں نے کہا: "میں خُدا کے فضل سے ویسی کی ویسی ہوں۔ تم بتاؤ، تم کیسی ہو؟" اور وہ تیوری چڑھا کر چلی گئی۔

کہتے ہیں اس نے گاؤں کی بہت سی عورتوں کو جمع کر کے بتایا کہ وہاں شہر میں بڑی بڑی عورتیں چھوٹی چھوٹی عورتوں کی بڑی مدد کرتی ہیں۔ سال میں ایک دو بار دیگیں پکا کر ان کے بچّوں کو میٹھے چاول کھلاتی ہیں اور انہیں دودھ کا سفوف دیتی ہیں۔ اب انہوں نے گاؤں گاؤں جانے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔

نا بہنو، ادھر نہ آنا۔ یہاں گاؤں میں تو پاکستان کی چار کروڑ عورتیں بستی ہیں۔ پہلے تم شہر کی آدھ پون کروڑ عورتوں سے تو نبٹ لو۔ تم تو انہیں کے آنسو جمع کرو تو کتنے تالاب بھر جائیں گے۔ یہاں آؤ گی تو آنسوؤں کے سمندروں میں ڈوب جاؤ گی۔ تم جو پیدل چلو تو تمہیں بخار آجاتے۔ تم ان سنگ زاروں اور خارستانوں کے کڑے کوس کیسے طے کرو گی؟ نا بہنو، نا۔ خودکشی مت کرو۔

مگر یہ میں باتوں میں کہاں نکل گئی۔ اس وقت میری بیٹیاں قطار میں بیٹھی ایک دوسری کی جوئیں دیکھ رہی ہیں۔ میرے بیٹے کے ہل کی پھال ٹوٹ گئی ہے اور وہ لوہار سے نئی پھال بنوانے کے لئے کہیں سے قرض لینے گیا ہے۔ میں مٹکے کا ڈھکنا اٹھائے سوچ رہی ہوں کہ نئی فصل اُٹھنے میں تو ابھی چار مہینے باقی ہیں اور مٹکے میں تو چار دن کا بھی اناج باقی نہیں۔

نہ مٹکے میں اناج ہے، نہ صندوق میں کپڑا ہے، نہ جیب میں پیسہ ہے۔ اگر کچھ ہے تو آنکھوں میں آنسوؤں کی چنگاریاں ہیں اور دِل میں جیسے کسی نے

بھڑوں کے چھتّے کو چھیڑ دیا ہے اور ہونٹوں کی اکڑی ہوئی پپڑیوں میں یہ دُعا اٹھی ہوئی ہے کہ الٰہی! تو جو ایک کو لاکھوں دے ڈالتا ہے۔ لاکھوں کو ایک ایک تو عطا کر دیا کر۔ ہم بڑے شاکر اور صابر لوگ ہیں۔ ہم خُون کے گھونٹ پی کر بھی جی سکتے ہیں، مگر رگوں میں خُون بھی تو ہو۔ ہم مٹی چاٹ کر بھی زندہ رہ سکتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہم سانپ نہیں ہیں۔ ہم تو اشرف المخلوق ہیں۔ ہم تو زمین پر تیرے خلیفے ہیں۔

۱۹۶۲ء

ایک احمقانہ محبّت کی کہانی

جس رات تمہارے ابّا جان نے مجھے کھانے پر مدعو کیا تو وُہ خوش بھی تھے اور حواس باختہ بھی۔ وہ اپنے ایک پُرانے ہم مکتب سے مل کر خوش تھے، مگر اپنی بیوی کی وجہ سے حواس باختہ تھے۔ دوسرے دن صبح انہوں نے مجھُے بتایا کہ رات ان کی بیوی تمہیں جنم دے کر رُخصت ہو گئیں۔

اب تم انیس بیس برس کی عالیہ ہو اور مَیں اکتالیس سال کا صدیق احمد ہُوں، اور تمہارے ابّا جان نے چند روز پہلے اپنی سینتالیسویں سالگرہ منائی تھی۔ عمروں کا یہ تفاوت بظاہر طویل فاصلے پیدا کر دیتا ہے، مگر عالیہ! یہ فاصلے کتنے بے حقیقت، کتنے بے مفہوم ہیں! اور اگر ان کا کوئی مفہوم ہے تو تم، جو عُمر کے معاملے میں مجھُ سے اتنی دُور ہو، مجھے اتنی پیاری کیوں ہو کہ مَیں تمہیں ہر وقت اپنی شہ رگ سے بھی قریب محسوس کرتا ہُوں۔

تمہارے ابا جان میرے ہم جماعت تو نہیں تھے، البتہ ہم مکتب ضرور تھے۔ میں پہلے سال میں تھا اور وہ آخری سال میں تھے، مگر ایک سال تک ہم ایک ہی گروپ میں رہے اور ایک ہی کھیل کھیلتے رہے۔ پھر وہ فارغ التحصیل ہو کر کہیں چلے گئے اور جب اس کے کوئی چھ سال بعد میں ایک غیر ملکی فرم میں ایک اسامی

کے لئے انٹرویو دینے آیا، تو میں نے پہلی ہی نظر میں انہیں پہچان لیا۔ مجھے اُن کے بیٹھنے اور گفتگو کرنے کے انداز سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ باقی دونوں افسروں سے بھی بڑے افسر ہیں۔ انہوں نے جب میری درس گاہ کا نام سُنا تو چونکے۔ پھر میں نے دیکھا کہ وہ اپنی مسکراہٹ کو چھُپا رہے ہیں، مگر عالیہ، تمہیں تو معلوم ہی ہو گا کہ انسان قتل تک کو چھُپا سکتا ہے، مگر اپنی مسکراہٹ نہیں چھپا سکتا۔ مسکراہٹ صرف ہونٹوں کی محتاج نہیں ہوتی ہونٹوں پر قابو پا لو تو آنکھیں مسکرانے لگتی ہیں۔ آنکھیں جھکا لو، تو چہرے کی رنگت مسکرانے لگتی ہے۔ میں حسابی کتابی آدمی، مجھے ان نازک چیزوں کا علم قطعی نہیں ہو سکتا تھا، مگر شاید تمہیں یاد نہ ہو، جب تم پہلی بار مسکرائی تھیں، تو بالکل اس طرح مسکرائی تھیں کہ تم مسکراہٹ کو اپنی گرفت میں لینا چاہتی تھیں، مگر یہ تمہاری آنکھوں اور تمہارے چہرے، حتیٰ کہ تمہارے کانوں کی لووں تک سے ٹپکی پڑ رہی تھی۔

تمہارے آبا جان مسکراہٹ چھپانے کے باوجود آنکھوں سے مسکرا دیئے اور میں سمجھ گیا کہ انہوں نے مجھے پہچان لیا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے مجھے، مجھ سے بہتر قابلیت کے اُمیدواروں پر بھی ترجیح دی اور میں اس فرم کی ایک اہم اسامی کے لئے چُن لیا گیا۔

انٹرویو ختم ہوا اور میں باہر آیا تو کچھ دیر کے بعد ایک چپراسی نے آکر مجھ سے پوچھا: "کیا آپ کا نام صدیق احمد ہے؟"

میں نے کہا: "ہاں۔"

بولا: "آپ کو بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔"

پھر اپنے دفتر میں وقار بھائی مجھ سے لپٹ گئے اور بولے: "میں نے تمہیں پہچان لیا تھا، مگر انٹرویو میں اس کا اظہار ٹھیک نہ ہوتا۔ سمجھ گئے نا؟"

ظاہر ہے کہ میں سمجھ گیا تھا۔

پھر انہوں نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا اور عالیہ! یہ اسی رات کا ذکر ہے

کہ تم پیدا ہوئیں۔

میں پانچ سال تک وقار بھائی کی فرم میں رہا۔ جب مجھے اس سے بہتر نوکری مل گئی، تو خود وقار بھائی نے مجھے مشورہ دیا کہ مجھے وہاں چلے جانا چاہیئے۔ سو جب میں لاہور سے کراچی کی طرف چلا، تو تم نرسری کلاس میں جانے لگی تھیں اور مجھے صدیق انکل کہتی تھیں اور بہت موٹی اور لال گلابی لڑکی تھیں اور خوب ضدی تھیں اور خُوب روتی تھیں۔ تمہارے نقوش تمہارے پھُولے ہوئے گالوں میں دبک گئے تھے۔ تمہیں لان میں تتلیوں کے پیچھے بھاگتا دیکھ کر ایک دن میں نے وقار بھائی سے کہا تھا کہ عالیہ کو دیکھ کر کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی پہلوان سکڑ گیا ہے۔

میں جب وقار بھائی سے رخصت ہونے آیا اور تمہیں بھی بتایا گیا کہ صدیق انکل کراچی جا رہے ہیں، تو تم نے صرف اتنی بات کہی تھی کہ ہم بھی کراچی آئیں گے۔ اور جب میں تمہارے گال کو تھپتھپا کر اور تمہاری پیشانی کو چُوم کر چلا آیا تھا، تو مجھے تم مُدتوں تک یاد نہیں آئی تھیں۔ صرف جب وقار بھائی کو کبھی کبھار خط لکھا تو تمہیں دُعائیں لکھ دیں۔ میں کراچی سے ڈھاکے چلا گیا اور وہاں سے صرف ایک بار، آج سے یہی کوئی دو تین برس پہلے لاہور آیا۔ میں وقار بھائی سے بھی ملا، مگر اس وقت تم کالج گئی ہوئی تھیں سو میں تمہیں نہ دیکھ سکا، چنانچہ یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ تم کالج جانے لگی ہو، میرے ذہن میں تمہارا وہی پُرانا تصور قائم رہا کہ تم ایک موٹی، گول مٹول تھن متھنی سی لڑکی ہو اور بہت چٹوری ہو اور سخت ضدی ہو اور بات بات پر رونے لگتی ہو۔

آج سے کوئی ایک برس پہلے وقار بھائی نے مجھے ڈھاکے سے بُلا لیا۔ ان کی فرم میں ایک نہایت عُمدہ اسامی خالی ہوئی تھی اور وُہ مجھے بھولے نہیں تھے۔ میں واپس آیا۔ بچوں کو ان کے ننھیال میں چھوڑ کر جب میں لاہور میں وقار بھائی کی کوٹھی پر آیا، تو تم باہر لان میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھیں۔ میں نے سلام کیا، تو تم اُٹھ کھڑی ہوئیں اور

کہا: "فرمائیے؟"

تمہاری آواز عام لڑکیوں سے اونچی تھی مگر اس میں جو گونج تھی وہ عام لڑکیوں کی آواز میں نہیں ہوتی۔ آواز کی یہ گونج آواز والی کی صورت کے بارے میں عموماً دھوکا دے جاتی ہے، مگر تم تو اپنی آواز کی گونج کی طرح خوبصورت تھیں۔ تم اتنی خوبصورت تھیں کہ اگر میں ایک بیوی کا شوہر اور چھ بچوں کا باپ نہ ہوتا، تو انجام سے کوئی خوف کھائے بغیر ایک مسحور آدمی کی طرح تم سے پہلی بات ہی یہ کہتا کہ لڑکی، مجھے تجھ سے محبت ہو گئی۔

مگر میں نے کہا: "میں وقار بھائی سے ملنے آیا ہوں۔ میرا نام صدیق احمد ہے۔"

تب تم چونکیں اور مسکرائیں۔ یہ وہی مسکراہٹ تھی جسے مجھ جیسے آدمی نے بھی ہونٹوں سے آنکھوں تک اور آنکھوں سے کانوں کی لوؤں تک سفر کرتے دیکھا۔

تب تم نے کہا تھا: "ارے! صدیق انکل؟ ڈھاکے والے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا تو تم بولیں: "آداب صدیق انکل۔ میں عالیہ ہوں۔"
اور یہ کہہ کر تم وقار بھائی کو اطلاع دینے لان پر سے یوں تیرتی ہوئی سی گزر گئیں کہ مجھے تمہارے بازوؤں پر پروں کا گمان ہونے لگا۔

پھر میں وہیں تمہاری کوٹھی کے ایک کمرے میں رہنے لگا۔ آج یہ سطریں بھی اسی کمرے میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ آئندہ بھی یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔ اس کوٹھی کے کمروں میں تمہاری آواز کی گونج بند ہے۔ میں اس کوٹھی کے چمکتے دمکتے فرش پر تمہارا ایک ایک نقشِ قدم گن سکتا ہوں۔ مجھے یہ تک معلوم ہے کہ تم کالج جانے کے لئے جب میرے کمرے کے سامنے سے گزرتی ہو تو اپنی پلکوں کو کتنی بار جھپکتی ہو۔ تمہیں بھی یہ معلوم نہ ہو گا کہ تمہارے ایک کان کی لو کے پیچھے سوئی کی نوک کے برابر ایک تل ہے۔ میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ اس لئے کہ میں نے تمہیں صرف دیکھا ہی نہیں ہے، میں نے تمہیں پڑھا ہے، میں نے تمہیں رٹ رکھا ہے۔

تم کہتی ہو گی صدیق انکل کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ تم یہ کبھی نہیں سوچو گی کہ تم نے صدیق انکل کا کیا کر دیا ہے۔ تم اپنے آپ کو مجھ سے اکیس بائیس برس کے فاصلے پر پاتی ہو اور میں تمہیں نبض کی ایک دھمک کے فاصلے پر دیکھتا ہوں۔ قرب کا یہ تصور ان لوگوں کے نزدیک بے معنی ہو سکتا ہے جنہوں نے کبھی محبت نہ کی ہو ——— اور کی ہو، تو یونہی چلنت سی، جیسے دودھ میں اُبال آتا ہے، مگر تم یقیناً سمجھ جاؤ گی، کیونکہ تم نے محبت کی ہے۔ مجھ سے نہیں کی تو کیا ہوا۔ کسی سے تو محبت کی ہے۔

بظاہر یہ بہت شرم کی بات ہے کہ ایک آدمی جو ادھیڑ عُمر میں داخل ہو چکا ہے، ایک ایسی لڑکی سے محبت کرے جس نے بھرپور شباب میں ابھی قدم رکھا ہو۔ یقیناً بظاہر یہ بہت شرم کی بات ہے۔ پھر جب اس کی عُمر لڑکی کے باپ کے برابر ہو اور جسے لڑکی "انکل" کہہ کر پکارتی ہو، تو ایسی محبت شرمناک ہی کہلا سکتی ہے، مگر میں آج تمہارے سامنے اپنی اس شرمناک محبت کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔

عالیہ: میں تم سے محبت کرتا ہوں، یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے، مگر ہر بات کا سمجھ میں آ جانا ضروری تو نہیں ہوتا۔ ہم خُدا کو نہیں سمجھتے، مگر اسے مانتے ہیں؟ تمہیں ماننا ہو گا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ جواب میں تمہیں مجھ پر محبت نہیں آئے گی، ترس آئے گا۔ غصّہ بھی آ سکتا تھا، مگر صرف آج سے چھ مہینے پہلے جب تم نے محبت نہیں کی تھی۔ اب تو تم نے محبت کی ہے۔ اور جس طرح ساون کا بادل ٹوٹ کر برستا ہے، اسی طرح تم نے ٹوٹ کر محبت کی ہے اور جو محبت کرتا ہے اسے غصّہ نہیں آتا۔ اسی لئے میں نے کہا ہے کہ تمہیں مجھ پر ترس آئے گا۔

تم میرے ایک عزیز دوست کی بیٹی ہو جو میرا محسن بھی ہے۔ مجھے تم سے محبت نہیں کرنا چاہیئے تھی، مگر محبت تو زندگی اور موت کی طرح بے ساختہ چیز ہے۔ اس میں کسی کے ارادے کو کوئی دخل نہیں جس طرح آدمی پیدا ہوتا ہے، زندہ رہتا ہے اور مر

جاتا ہے، اسی طرح محبت کرنے لگتا ہے۔ مجھی کو دیکھو، آخر مجھے کیا پڑی تھی کہ ایک نیک، سلیقہ شعار اور قبول صورت بیوی کا شوہر اور ساتھ ہی چھ پیارے بچوں کا باپ ہوتے ہوئے، میں بیس پچیس برس کے نوجوانوں کی طرح راتیں آنکھوں میں کاٹ دوں اور صبح کو بستر سے یوں ہلکا پھلکا اٹھوں جیسے خوب گہری نیند سویا ہوں۔ اگر محبت کرنے میں نیت کا دخل ہوتا، تو میں تم سے محبت نہ کرتا۔ سو عالیہ! میں بالکل بے بس ہوں۔ سارا قصور تمہارا ہے کہ تم ناقابل برداشت حد تک خوبصورت ہو۔ جس طرح تم کہہ سکتی ہو کہ اگر میں خوبصورت ہوں تو اس میں میرا کیا قصور ہے، اسی طرح میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں نے تم سے محبت کی ہے تو اس میں میرا قصور کیا ہے۔

اس روز جب وقار بھائی تمہارے لئے آئے ہوئے ایک پیغام کا مجھ سے ذکر کر رہے تھے، تو میں ان کی زبان سے یہ سن کر دم بخود رہ گیا کہ تم میں صرف ایک کمی ہے اور وہ کمی یہ ہے کہ تم خوبصورت نہیں ہو۔ میرا جی چاہا۔ میں ان سے کہہ دوں کہ وقار بھائی، آپ کی بینائی کب سے چھن گئی؟ آپ اندھے کب ہوئے؟ آپ کی آنکھیں کب پھوٹیں؟ یہ سب سوال میرے ذہن میں آئے، مگر ان سے نہ پوچھ سکا۔ پوچھ سکتا تو بھی نہ پوچھتا۔ اس لئے کہ اگر ایک بار میں تمہاری خوبصورتی کا ذکر شروع کر دیتا، تو پھر میری زبان کو میری موت ہی روک سکتی تھی۔ باپ کے سامنے بیٹی کے حسن کی تعریف ہمارے معاشرے میں صرف وہی لوگ برداشت کرتے ہیں جو اس معاشرے کے معیاروں سے بہت نیچے گر جاتے ہیں یا بہت اوپر اٹھ جاتے ہیں۔ اور میں اگر صرف تمہارے ہونٹوں کے حسن کا ذکر چھیڑوں، تو کیا ایک دن یا ایک سال یا ایک صدی میں بھی ان کے گوشوں میں دھڑکتی ہوئی معصومیت اور ان کے خطوط میں خم کھاتی ہوئی شوخی اور ان کے اچھوتے پن کی جھلکتی ہوئی شادابی کا جائزہ مکمل کر سکوں گا؟ تم نے کبھی اپنے ہونٹوں پر غور کیا ہے عالیہ؟

تم اپنے ابا جان کی نظر میں خوبصورت نہیں ہو۔ میں ہر معاملے میں تمہارے ابا جان پر رشک کرتا ہوں، مگر اس معاملے میں مجھے ان کی ناسمجھی پر رحم آتا ہے۔ انہیں شکایت تھی کہ صرف تمہاری صورت کی وجہ سے تمہارے لئے اب تک کوئی اچھا پیغام نہیں آیا۔ انہوں نے مجھ سے مشورہ مانگا تھا اور میں نے کہا تھا کہ عالیہ سے بھی تو مشورہ کر لیجئے۔ انہوں نے میری طرف حیران ہو کر دیکھا تھا اور کہا تھا: "جی ہاں، زمانہ تو ایسا ہی آگیا ہے، مگر عالیہ میری بیٹی ہے اور میں اسے بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کے ذہن میں بی۔اے کا امتحان امتیازی طور پر پاس کرنے کے سوا کوئی جذبہ نہیں ہے اور شادی کے معاملے میں اس کی کوئی پسند ہو ہی نہیں سکتی۔"

میں یہ سن کر حیران رہ گیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ زمانہ ہزار ترقی کر جائے اور علوم ہزار آگے بڑھ جائیں اور روایات ہزار ٹوٹیں، باپ سادہ لوح کے سادہ لوح ہی رہیں گے۔ وہ بیٹی کو صرف اسی خول میں دیکھ سکیں گے جس میں وہ ان کے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کبھی نہیں سوچیں گے کہ انسانی جسم و ذہن کی ساخت ہر جگہ یکساں ہے اور جذبہ قید نہیں ہو سکتا اور دنیا کی ہر لڑکی کسی نہ کسی باپ کی بیٹی ہوتی ہے، مگر ہر باپ دوسرے کی لڑکی کے بارے میں جو کچھ سنتا، کہتا اور اندازے لگاتا ہے، وہ اپنی بیٹی کے بارے میں نہ سن سکتا ہے، نہ کہہ سکتا ہے، نہ اندازے لگا سکتا ہے۔ انسان بعض اوقات کتنا حماقت کی حد تک خودغرض نظر آتا ہے۔

جب میں نے ان پر زور دیا، تو وہ مان گئے، مگر اس شرط پر کہ تم سے اس پیغام کا ذکر مجھے کرنا ہوگا۔ یعنی میں جو تم سے محبت کرتا ہوں، تم سے پوچھنے کے لئے بھیجا جا رہا تھا کہ تم کس سے محبت کرتی ہو۔

جب تم کالج سے واپس آئیں، تو میں تمہارے پیچھے پیچھے ہو لیا اور جب تم نے اپنے کمرے میں جا کر پلنگ پر اپنی کتابیں پھینکیں اور دوپٹہ اتار کر تپائی کی طرف

اُچھال دیا اور ایک اتنی لمبی انگڑائی لی کہ مَیں حیران تھا تم نے اتنی دیر تک اپنی سانس کو کیسے روکے رکھا، تو میں نے تمہارے دروازے کے پاس آکر اور ایک طرف ہو کر ہلکی سی دستک دی۔ تم نے پوچھا "کون ہے؟"

اور مجھے تمہاری آواز کی وہ گونج یاد آگئی جو مَیں نے پہلے دن تمہارے "فرمایئے" میں سُنی تھی۔ تب میں نے سوچا کہ مجھے کچھ کہے بغیر وہاں سے بھاگ جانا چاہیئے۔ اس کوٹھی سے، اس شہر سے بھاگ جانا چاہیئے تاکہ وہ پھُول جو میرے ذہن میں کِھلا ہے مرجھانے نہ پائے۔

مگر پھر تم باہر آگئیں اور تم نے کہا: "انکل"! پھر تم میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ اس وقت میں نے تمہارے چہرے کے آئینے میں اپنے چہرے کا رنگ دیکھ لیا تھا۔

"کیوں انکل!" تم نے کہا تھا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

میں تمہیں کیسے بتاتا کہ میں اپنی محبّت کے کھنڈر میں سے نکل کر تمہاری محبّت کی تعمیر میں تمہارا ساتھ دینے آیا ہوں۔ مَیں فوراً تمہارے کمرے میں چلا آیا اور مَیں نے جلدی جلدی بولنا شروع کر دیا جیسے میں کوئی اداکار ہوں اور اپنے رٹے ہوئے مکالمے دوہرا رہا ہُوں۔

"عالیہ تمہیں مجھ پر اعتماد ہے نا؟ تم اپنے انکل کو اپنا دوست بھی سمجھتی ہو نا؟"

اور تم نے کہا تھا: "دوست! مَیں تو آپ کو اپنے ابّو کے برابر سمجھتی ہوں انکل۔"

تب میرا رنگ کچھ اور اڑ گیا، کیونکہ تم گھبرا کر میرے پاس بیٹھ گئیں اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جب تم نے میری آنکھوں میں نمی کی تہہ دیکھی، تو تم بے قرار ہو گئیں اور تم نے کہا: "نہیں انکل! روئیے گا نہیں۔ پہلے مجھے بتائیے کہ بات کیا ہے۔ آپ اپنی بھتیجی کو اپنی دوست بھی سمجھتے ہیں نا؟ پھر مجھے بتاتے کیوں نہیں؟ کیا مَیں آپ کے کسی کام آسکتی ہوں انکل؟" تب تم نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور کہا: "میں دس تک گنتی ہوں۔ جب تک آپ نے آنسو پی لئے تو ٹھیک ورنہ پھر میں بھی رونے لگوں گی۔ اوّل تو روتی نہیں ہوں،

لیکن اگر رونے لگوں تو میرا پروگرام بہت لمبا ہوتا ہے۔ لیجئے مَیں گنتی ہوں۔ ایک، دو، تین۔"

پھر تم رُک گئیں تھیں کیونکہ میں تمہارے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور میں تمہاری ہی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ تمہارے انکل کا ہاتھ تھا۔ میرے دل میں تمہارے لئے محبّت تھی اور میرے ہاتھ میں تمہارے لئے شفقت تھی۔ تم کہو گی انسان ایک ہی لمحے میں اپنے آپ کو دو شخصیتوں میں کیسے بانٹ سکتا ہے اور میں کہتا ہوں کہ انسان اپنی ذات میں ایک جہان ہے اور اس جہان میں پہاڑ اور جنگل، سمندر اور میدان، بادل اور ستارے، صحرا اور دلدلیں، غرض کیا کچھ نہیں ہے!

یہ چند لمحے، جب تم میرے سینے پر سَر رکھے ہوئے بیٹھی رہیں، میری محبّت کا سب سے بڑا انعام تھے۔ تم سے میرے سارے مُطالبات اس نقطے پر پہنچ کر ختم ہو جاتے ہیں، کیونکہ اس کے بعد جب میں نے تمہیں بتایا کہ تمہارے لئے افضل کا پیغام آیا ہے مگر تمہارے ابّا جان اس پیغام سے خوش نہیں ہیں تو تم تڑپ کر اُٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ پھر تم شرما کر بیٹھ گئی تھیں اور مَیں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس رشتے کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔

تم نے اُٹھ کر دروازہ بند کر دیا تھا اور تم زار زار رونے لگی تھیں۔ اور تم نے میری منت کی تھی کہ مَیں کسی کو بتاؤں نہیں کہ تمہیں افضل سے بے پناہ محبّت ہے اور تم نے ہی افضل سے کہا ہے کہ وہ تمہارے ابّا جان کو باقاعدہ پیغام بھجوائے اور اگر وہ انکار کر دیں، تو تم دونوں اکٹھا مر جاؤ۔

یہ چند لمحے جو تم نے اپنی محبّت کے ذکر میں گزارے، میری محبّت کی سب سے بڑی مسرّت اور سب سے کڑا کرب ہیں۔

عالیہ! میں نے تم سے محبّت کی ہے نا۔ مَیں نے تم سے بڑی بھرپور، بڑی احمقانہ محبّت کی ہے۔ یہ اسی محبّت کا نتیجہ ہے کہ میں تمہاری خاطر تمہارے خاندان

سے لڑتا رہا ہوں۔

میں نے جب وقار بھائی کو بتایا کہ تمہیں افضل کے رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے تو وہ آپے سے باہر ہوگئے اور تمہیں بے نقط سنانے لگے۔ انہوں نے کہا کہ میں ہی جاکر تمہیں بتاؤں کہ افضل ایک معمولی، یعنی غریب خاندان کا ایک عام سا گویا اوسط درجے کا آدمی ہے، اور تم تین ہزار ماہانہ پانے والے ایک امیر آدمی کی بیٹی ہو اور تمہیں متوسط طبقے کی لڑکیوں کا سا کوئی جذباتی فیصلہ نہیں کرنا چاہیئے اور مستقبل کی ترازو میں اپنا نفع نقصان ماشے اور رتی کی حد تک تول لینا چاہیئے۔

یہ کتنی عجیب صورتِ حال تھی عالیہ! میں جو تم سے محبت کرتا ہوں، تمہیں یہ کہنے کے لئے تمہارے پاس بھیجا جا رہا تھا کہ تم جس سے محبت کرتی ہو، اس سے محبت کرنا چھوڑ دو! بھلا میں ایسا کیسے کہہ سکتا تھا! میں نے محبت نہ کی ہوتی، تو شاید کہہ دیتا، مگر میں نے تو محبت کی تھی اور میری اس محبت کا تقاضا یہ تھا کہ میں تمہاری محبت کو حادثہ نہ بننے دوں۔

سو میں نے تم سے کہا تھا کہ وقار بھائی نہیں مانتے، مگر انہیں ماننا پڑے گا ورنہ اپنی بیٹی کے انکل سے بھی ہاتھ دھو لینے پڑیں گے۔ میں نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ تم ثابت قدم رہو اور یہ ذمّہ داری میں سنبھالتا ہوں کہ تمہیں افضل کی بیوی بنا کر دم لوں گا۔

حیران نہ ہو عالیہ! محبّت صرف انتقام لینا ہی تو نہیں سکھاتی۔ محبت تو دراصل محبت کرنا سکھاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جب میں تمہیں افضل سے محبّت نبھانے میں مدد دے رہا ہوں تو دراصل تم سے محبّت کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں تم اس وقت میری حماقت پر مسکرا رہی ہو، مگر عالیہ! حماقت اور محبت میں تھوڑا سا فرق ضرور ہوتا ہے۔ یہ سلیقے کا فرق ہے اور اس سے تمہیں بھی انکار نہیں ہونا چاہیئے کہ اگرچہ میں نے تم سے احمقانہ محبت کی ہے، مگر بڑے سلیقے کی محبّت کی ہے

کئی دنوں اور جھگڑوں اور بحثوں کے بعد آج وقار بھائی مان گئے ہیں۔ مجھے

چاہیئے تھا کہ تمہیں یہ خوش خبری فوراً پہنچاتا، مگر پھر میں نے سوچا کہ پہلے تمہارے نام یہ خط لکھ دوں۔ دراصل آج میں بہت خوش ہوں۔ آج میں نے تم سے اپنی محبت انتہا تک نبھا دی ہے۔ میری سب سے بڑی خوشی یہ ہے کہ تمہیں خوش دیکھ سکوں۔ لوگ اسے محبت کا امتحان کہیں گے، میں اسے محبّت کی پہچان کہتا ہوں۔

عالیہ! میں نے تمہیں حاصل کرنے کے لئے تو تم سے محبت نہیں کی تھی۔ میں نے تو تم سے خالی خولی محبت کی۔ صرف اس لئے کہ تم ناقابلِ یقین حد تک خوبصورت ہو۔ اور اس لئے کہ تمہاری آواز کی طرح تمہاری ساری شخصیت میں ایک گونج سی ہے۔ کبھی ایک لمحے کے لئے بھی میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ تم میری ہو تیں۔ میں ایسا سوچتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ میں تم سے محبت نہیں کر رہا ہوں، دشمنی کر رہا ہوں۔ سو افضل کے ساتھ تمہارے چلے جانے کے بعد مجھے محرومی کا احساس قطعی نہیں ستائے گا۔ جب میں تمہارے ساتھ محبّت کئے جاؤں گا تو محرومی کیسی؟

۱۹۵۴ء